آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اکتوبر 2024

www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹15/-

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل	مدیر	4

جہان نسواں

ڈاکٹر امام اعظم: جہانِ ادب کا ایک بے لوث سیاح	شمع اختر کاظمی	5
اجین کے شعرا کے کلام میں ظریفانہ عناصر	ڈاکٹر عشرت ناہید	8
'ہم سفر' آپ بیتی جگ بیتی	ڈاکٹر ناز بیگم	12
ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں عورت کا کردار	ڈاکٹر محمد رضا	15
خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں کشمیر کی تہذیب و معاشرت	ڈاکٹر محمد شریف	18
اردو غزل میں تصوف کا رنگ	ڈاکٹر شیخ کنیز فاطمہ	20
احمد جمال پاشا بحیثیت طنز و مزاح نگار	مہر فاطمہ	30
جدید شاعر: فضیل جعفری	نصرت پروین	35
فاطمہ تاج کی ادبی خدمات	شیریں فاطمہ	39

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار		42

افسانہ

یہ دل منتظر	نیلوفر سعدیہ	43
آئینے کا رخ	ندا احمد	48
بازوئے یقین	زینت فاطمہ ایس کے کبیر	50
شکوہ اور شکر	زرینہ عبدالسلیم	52

حسن سخن

جوہی عشرت، انعم جویریہ، شاہینہ پروین		55

صحت

خوبصورتی کا راز: کاسمیٹک پروڈکٹس	ڈاکٹر ابوطالب انصاری	57

قارئین کے خطوط

مراسلہ		61

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 8 شمارہ: 10 اکتوبر 2024

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/15 روپے، سالانہ-/145 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

عورتوں پر ظلم و جبر کی کہانی صدیوں پر محیط ہے لیکن ایک وہ وقت بھی تھا جب خواتین قبیلوں کی سربراہ ہوا کرتی تھیں اور سلسلۂ نسب بھی ان ہی کے نام سے چلتا تھا۔

مگر امہاتی نظام بدلا تو معاشرے میں مردوں کو فوقیت اور ہر میدان میں مردوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ سیاسیات ہو یا اقتصادیات حتیٰ کہ مذہبی اعتبار سے خواتین مردوں کے پیچھے ہی رہ گئیں۔

تانیثیت خواتین کے خلاف اسی تعصب اور تشدد کی نفی کرتی ہے اور اپنے حقوق کے تئیں خواتین میں بیداری کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ تانیثیت خواتین کو سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر خود کفیل ہونے پر زور دیتی ہے۔ تانیثیت اسی صنفی تعصب اور تفریق کے خلاف ایک ردعمل اور احتجاج ہے۔ عقلی اور جذباتی سطح پر خواتین کو دوئم اور کم عقل تصور کیے جانے جیسے تصور کو بھی مسترد کرتی ہے۔ تانیثیت خواتین کو ان کے حقوق کے تئیں سنجیدہ بناتی ہے۔ تانیثیت کے بنیادی تصورات کو نسوانیت سے الگ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ تانیثیت کا تصور خواتین کی تلاش و جستجو کا نام ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک خواتین اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کو ووٹ دینے کا حق بھی حاصل ہو گیا اور سیاسی سطح پر بھی وہ کسی حد تک سرگرم ہو گئیں۔ ان میں یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ وہ کسی بھی معاملے میں مردوں سے کمتر ہرگز نہیں ہیں اور ہر محاذ پر اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں۔

دور جدید میں خواتین نے مردانہ جبر و استحصال کے خلاف بغاوت کا بگل بجا دیا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو مرد سے الگ اور ایک مکمل اکائی تصور کرنے لگی ہیں خود مختاریت / امپاورمنٹ نے ان کی سوچ کو پوری طرح تبدیل کر دیا ہے۔ وہ اب ہر شعبہ حیات میں کامرانی کی تاریخ رقم کر رہی ہیں اور اعلیٰ اور مناصب عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی مردوں کی ہمسری کر رہی ہیں۔ خواتین کو اونچی اڑان بھرنے میں گو کہ بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن قوت فکر عمل نے ان کے اندر بے پناہ توانائی بھی پیدا کر دی ہے اور اب وہ ہر سطح پر مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور اپنی فعال اور پرقوت موجودگی کا احساس معاشرے کو کرا رہی ہیں۔

آپ کا

شمس اقبال

شمع اختر کاظمی

ڈاکٹر امام اعظم

جہانِ ادب کا ایک بے لوث سیاح

یہ کاغذ قلم کے رشتے بھی کتنے خوبصورت اور بامعنی ہوتے ہیں کہ جن سے ملاقات نہ بھی ہو پھر بھی تحریر حوالے بنتے ہیں، ذہنی وفکری ہم آہنگی کا انجانا مگر جانا پہچانا سا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔ امام اعظم تو قرابت داروں میں بھی تھے اور قلم کے رشتے میں بھی۔

وہ تخلیقی ادب کا اتھاہ ساگر تھے۔ دنیائے شعروادب میں اپنی مختلف النوع کاوشوں کے سبب منفرد شناخت بنائی۔ ہر تخلیق اعلیٰ پائے کی حسن وسلیقے کے ساتھ منظر عام پر آئی۔ قلم کی روانی ذوق وظرف اور جہد مسلسل بھی ہم رکاب رہا۔ نئے نئے موضوعات خلق کرنا پھر پوری دلجمعی اور حسن وخوبی کے ساتھ اس کام کو انجام تک پہنچا کر دم لینا، ان کی مقبولیت اور عظمت میں بہت سارے عناصر کارفرما رہے۔ علم وفن کا ایک مدوجزر سمندر اپنے وجود میں سمیٹ رکھا تھا۔ جب وہ اپنے راستے متعین کرتا تو ادب کے رہ گزار لہلہا اٹھتے اور ایک منفرد تخلیق وجود میں آتی۔ علم وادب کے حوالے سے ایک پورے دور کی آواز ان کی تحریروں میں سنی جاسکتی ہے۔ کئی ادبی وتخلیقی نوعیت کے متنوع موضوعات پر مشتمل کتابیں دنیائے ادب کو دیئے۔ عالمی سطح پر نئے مشمولات کے حوالے سے مثبت نشاں ثبت کیے۔ ساتھ میں منفرد طرزِ بیاں کے فن کا ذائقہ بھی قاری کو چکھایا جو ادب کی ضرورتوں کا حصہ بھی رہا۔ موصوف بڑے مدبرانہ اور متوازن انداز میں کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کرتے۔ ان کی علمی، ادبی وتحقیقی صلاحیتوں کا ادب شناس طبقہ ہمیشہ معترف رہا۔ انفرادی فکر، حسن ذوق، اعلیٰ صلاحیت ونفاست کی داد زمانہ دراہا ہے۔

شعراء وادباء کی نئی نسل سے تعلق ہونے کے باوجود پرانی تہذیب کو گلے لگائے، ادب وآداب کے قائل رہے۔ یہ ان کا وصف رہا کہ جدید تر اور ہوش مند ذہنوں پر حکمرانی کی، اردو دنیا کے کتنے معروف مشاہیر قلم ان کے گرویدہ رہے۔ نفس اگر نیک ہے تو اس کے فکر وعمل میں انسانی دردمندی

کی جھلک نظر آ ہی جاتی ہے۔ اپنی نیک نامیوں ،اپنی جدوجہد اور اپنے کارناموں پر کبھی بڑبولے پن کا اظہار نہ کیا، سب سے جھک کر ملے، ملنے والوں کو احترام وعزت بخشی اور عالمی اردو ادب میں انہیں پذیرائی نصیب ہوئی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کولکاتا کے ریجنل ڈائرکٹر رہے۔ اپنے منصبی فرائض ادا کیے ،اسی دوران اٹھارہ کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔ گزشتہ پچیس برسوں سے جریدہ 'تمثیل نو' کے مدیر اعزازی رہے جو پابندی سے وقت اور معیاری ادبی تخلیقات کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کے کئی خاص گوشے شائع ہوئے۔ ان کے ادبی کارناموں کو بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔ وہ ایسے خوش نصیب قلم کار رہے جن کی حیات میں ہی انہیں پذیرائی ملی اور خدمات کے اعتراف سے سرفراز ہوئے ان کے اندرون ایک ایسا متلون مزاج فنکار موجود تھا جو انہیں کسی پل سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا جو ادب کی پیاس بھی بڑھاتا اور حوصلے کی لاٹھی بھی تھما دیتا۔

امام اعظم کو ذاتی وفکری اور ادبی حوالوں سے سمجھنا ہو تو ان کے مکتوبات کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ وسیع تعلقات بنانا، نبھانا بھی ایک ہنر ہے جس کی فہرست طویل ہے۔ ادباء وشعراء کے علاوہ رشتے داروں ،قرابت داروں سے بے طرح انسیت اور ان کے ربط میں رہنا موصوف کی خصلت تھی۔ وہ حسن اظہار کی لطافت اور لفظ ومعنی کے رشتے کی نزاکت وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ تقریباً تین دہائیوں پر محیط علمی وادبی سفر بھرپور وقار کے ساتھ طے کیا۔ ان کا انسانیت نواز، خوددار وجود سب کے لیے ابر کرم کا سا تھا۔ علم وادب سے لگاؤ الگ چیز ہے مگر ایک عام انسان بن کر لوگوں کے لیے راحت رساں بننا دوسری چیز اور یہی خوبی کسی انسان کو 'بڑا' بناتی ہے۔

موصوف کے فن وشخصیت سے متاثر ہو کر قابلِ ذکر کتابیں ،دیگر شعراء وادباء نے تحریر کی جو درج ذیل ہیں :

ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ، مصنف ڈاکٹر ایم صلاح الدین (2012)، عہد اسلامیہ میں دربھنگہ: تحلیل وتجزیہ، مرتب سرور کریم (2013)، دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات کے حوالے سے، مصنف ڈاکٹر سرور کریم (پی ایچ ڈی مقالہ) (2014)، ڈاکٹر امام اعظم کی نازآفرینی ،مصنف پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (2018)، تمثیلِ نو: ادبی صحافت کا نقش، مرتب ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، Proximal Warmth (قربتوں کی دھوپ کا ترجمہ)، مترجم سید محمود احمد کریمی (2018)، چٹھی آئی ہے (مکاتیب)، مرتب شاہد اقبال (2020)، جہانِ ادب کا سیّاح (ادبی جائزہ)، مصنف پروفیسر خالد حسین خان (2021)، ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی جہتیں، مرتب شاہد اقبال۔

امام اعظم نے جس سرزمین پر آنکھیں کھولیں اس دیار میں ہر دور میں مفکر، دانشور، علماء وادباء نے اسے مہر تابانی عطا کی اور ادب کے گلشن کو توانائی بھی ملی۔ ان کی تحریروں سے ان کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک ذہین، حساس، سادہ لوح اور حقیقت پسند انسان کی ہے۔ اپنی علمی وادبی اور صحافتی صلاحیتوں کو اتنی سمتوں میں اور اس باوصف طریقے سے بکھیر رکھا کہ کسی کو ان کی مرکزی حیثیت کو پہنچانا مشکل ہے۔

امام اعظم کی کتابوں کے مطالعے سے ان کی علمی بصیرت، تحریری قوت اور ادبی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دوشعری مجموعے منظر عام پر آئے: 'نیلم کی آواز'..اور... 'قربتوں کی دھوپ'......کلام میں حسن وہنر اور شعری ظرف اعلیٰ موجود ہے۔ گیسوئے غزل کی زیبائش میں جذبات کی ترجمانی کا سلیقہ، محبت والفت، وفا اور جفا کی کیفیت سے گزارنے کا سلیقہ بہ درجہ اتم موجود ہے۔ وہ ایک عبقری قلم کار اور ذی ہوش شاعر رہے۔ فنی اعتبار سے روایت کے پاسدار رہے لیکن روایت سے وفا نبھائی تو جدت سے اپنے کلام کو اچھوتا بھی نہ رکھا۔ موصوف کے شعری مجموعے 'قربتوں کی دھوپ' کا انگریزی زبان میں ترجمہ سید محمود احمد کریمی نے Proximal Warmth کے نام سے کیا۔

''چٹھی آئی ہے''...... خط ایسی تحریر کو کہتے ہیں جس کا جادو اور ذائقہ برسوں قائم رہتا ہے۔ جب بھی پڑھیں وہی لطف ساحرانہ دل پر محسوس ہوتا ہوگا۔ اس کیفیت سے وہی بہرہ اندوز ہوسکتا ہے جس نے دوستوں کی چاہت کا جواب خلوص دل سے دیا ہوگا اور دوستوں ،خیر خواہوں اور چاہنے والوں کی چٹھیاں سمیٹ کر رکھی ہوں۔ خطوط کا یہ ذخیرہ دلالت کرتا ہے کہ امام اعظم کو خیر خواہوں کی کتنی قدردانی نصیب تھی۔

سہرے کی ادبی معنویت: صنف سہرا کو اللیلی سخن بھی کہا جاتا ہے۔ ماضی میں شادی بیاہ کے موقع پر سہرا لکھوانے اور سہرا خوانی کی روایت رہی ہے۔ اسداللہ خاں غالب، بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق نے سہرا کہا اور پڑھا بھی۔ شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر غالب نے سہرا لکھا اور سہرا خوانی کی۔ لیکن بعد کے ادوار میں دھیرے دھیرے یہ صنف گویا معدوم ہوتی گئی۔ امام اعظم نے 'سہرے کی ادبی معنویت' کے عنوان سے اس متروک صنف پر بڑی کدوکاش کے ساتھ نہ صرف سہرا لکھوایا بلکہ کتابی شکل میں اسے شائع بھی کیا۔ اس مقام پر بھی وہ معجز صفت امام نظر آتے ہیں۔ ایسی خفتہ صنف کو بیدار کرنے کا سہرا بھی امام اعظم کے سر جاتا ہے۔

تازہ کتاب ''انساب وامصار'' حسب ونسب کی تاریخ، ہماری تہذیب وثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔ قرآن وحدیث میں اپنے نسب کا

تحفظ اور خانوادوں کی شناخت برقرار رکھنے کے حکم سے مسلمانوں نے اپنے قبیلوں، خانوادوں، نسب ناموں اور شجروں کو محفوظ کرنا شروع کیا۔ بعد کے ادوار میں سلسلہ نسب نامہ گویا معدوم سا ہوتا گیا۔ نسب ناموں کی ترتیب وتدوین کا کام نہایت عرق ریزی اور تحقیق کے ساتھ چھان پھٹک کا متقاضی ہے۔ ٹھوس حقائق اور صحت مند معلومات کی بنیاد پر شجرے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس صنف میں نہ تخیل کی بلند پروازی کا کوئی عمل دخل ہے نہ کسی شواہد کی بلکہ یہ ٹھوس حقائق اور صحت مند معلومات کی بنا پر اپنا وجود رکھتی ہے۔

امام اعظم کی نئی کتاب ''یہی ہے کولکاتا'' : کولکاتا کی مختصر منظوم تاریخ جو نظم کے فارم میں اتنی طویل تخلیق متند تاریخی، سماجی، ادبی اور سیاسی حوالوں کے ساتھ حالیہ دنوں منظر عام پر آئی۔ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو شہر کولکاتا سے بے پناہ عقیدت ومحبت رکھتا ہو۔ ماضی کی اتنی خوبصورت اور سچی تصویر، حال کے مزاج وحالات کا جائزہ یقیناً ایک معرکہ سر کر لینے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ سے لے کر عصر حاضر تک کے تقریباً ڈھائی سو سے زائد اہل قلم، مفکر، دانشوروں، فنکاروں اور سیاست دانوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ بنگال کلچر، عصری علوم کے ادارے، لائبریری، فورٹ ولیم کالج، خلافت کمیٹی کی شاخ، بنگال کی معیشت، ثقافت، رسم ورواج، صحافت کی ابتداء، مولانا آزاد کے اخبارات، تھیٹر، اسٹیج، اس کے فنکار، کھیل کود کی سرگرمیاں، شاہی مسجد، مسجد ناخدا اور دوسرے مساجد، مشہور منادر، ہوڑا برج، سیاحتی مقامات، پارکس، ریستوران، سیاسی سرگرمیاں اور ممتا بنرجی کولکاتا کے حوالے سے یہ اشعار بحرِ ذخائر ہیں اور اسے کئی عہد کی زرین تاریخ کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

دراصل امام اعظم نے شہر نشاط کولکاتا کو جس انداز میں منظوم کیا ہے وہ اپنے آپ میں انوکھا اور انفرادیت کا حامل ہے۔

نظم کے بیانیہ میں روایتی موزونیت وشعریت کے آنچ کم کم سہی مگر نثری نظم کے زمرے میں شامل اس نظم پر کولکاتا واسیوں کو فخر ہونا چاہیے۔ نظم کے نمونے....

(1) ہوڑہ برج
ماورائی خاکوں سے بھرا ہوا لوہے کا جال
جادوئی حکمت کا کمال
یا پھر کرشماتی ذہن کا پھیلاؤ
فاصلہ در فاصلہ مقناطیسی کنارہ
نیلے آسمان کی طرح
بوجھ سے لدی کاروں اور بسوں
کے اژدہام کو جھیل جاتا ہے
ہاں وہی جو پہلے کلکتہ تھا
اب کولکاتا ہے !

(2) کالی گھاٹ سے زکریا اسٹریٹ تک
اک روحانی اور دھارمک بندھن
جیسے ناقوس اور اذاں کی گونج
گنگا جمنی تہذیبوں کا پاکیزہ سنگم
بلا کسی عذر ہر موڑ پر نظر آتا ہے
ایک ہی پہچان
جب برستا ہے ساعت پر
''ایکلا چلو رے'' کا حوصلہ افزا بول
تب ابھری پڑتی ہے فن کی کوکھ سے
ایک نئی امید......عزم جگانے اور جاگنے کا
ٹیگور کا ادب خود بخود ہر سمت پھیل جاتا ہے
ہاں وہی جو پہلے کلکتہ تھا
اب کولکاتا ہے!

سند رہے کہ ڈاکٹر امام اعظم کی پیدائش محلّہ گنگوارہ، دربھنگہ (بہار) تاریخ پیدائش 20 / جولائی 1960 اور وفات 22 / نومبر کی شب 2023 کو ہوئی۔

امام اعظم مرحوم اعلیٰ انسانی اوصاف وخصلت کے حامل تھے۔ ان کی قلم کاری کے جوہر سے تو زمانہ آشنا رہا لیکن وہ ایک ہمدرد وغم خوار انسان تھے۔

□□□

Shama Akhtar Kazmi
Flat No. 904, Wing - C
Archana Hill Town,
N.I.B.M. Road,
Kausar Bagh,Kondhwa
Pune - 411 048 (M.S)
Mob. : 9284690949a
E-mail:akhtark57@gmail.com

عشرت ناہید

اجین کے شعرا

کے کلام میں ظریفانہ عناصر

اردو شاعری کے ارتقا کا جب بغور جائزہ لیا جاتا ہے تو ہمیں ابتدا سے ہی شاعری کے دو رنگ نظر آتے ہیں۔ایک سنجیدہ دوسرا مزاحیہ یا طنزیہ۔دوسرے انداز کی ابتدا جعفر زٹلی کی شاعری سے ہوتی دکھائی دیتی ہے جو اپنی بات کو طنزیہ پیرائے میں ڈھال کر سماجی اور معاشرتی اور انسانی اقدار کی پامالی کو موضوع بنا کر پیش کرتا ہے۔ پھر نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب، اکبر الہ آبادی اس روایت کو استحکام بخشتے ہیں۔شاعری کے دونوں رنگ اردو زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تمام خطوں تک پہنچتے ہیں۔اسی سفر میں وسط ہند کے قدیم شہر اجین کا بھی ذکر آتا ہے، جہاں بارہویں صدی میں خواجہ نظام الدین کے خلیفہ خواجہ مغیث الدین چشتی کی آمد کے بعد اردو زبان کے نقوش عوام کے درمیان ملنے لگتے ہیں۔نتیجتاً یہاں اردو کی محفلیں سجنے لگتی ہیں، مشاعرے اور بیت بازی کا اہتمام دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کے شعراء میں اہم نام کرامت علی بشر کا ملتا ہے جنہیں فخر مالوہ کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔ان کے تلامذہ میں شعراء کا ایک بڑا حلقہ تیار ہوا جن میں گویا قریشی، امیر الدین امیر، عبدالرحیم، حسرت قریشی، حکیم محمد عمر مہر، عزیز محمد قیصر پنڈت چھجو سنگھ صادق، رشید الدین رشید امیر علی شبنم، احمد علی وفا، شرر، کمتر، اور رہبر جیسے نامور شعراء شامل رہے۔

اجین کے ادب کا مطالعہ کرنے پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو کے ابتدائی دور سے ہی یہاں نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کی گئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نثر کی بہ نسبت نظم پر زیادہ توجہ دی گئی اور نظم کی تمام اصناف کو اور تمام موضوعات کو برتا بھی گیا۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کی شاعری میں طنز و مزاح کے عناصر بھی ابتدائی دور سے ملتے ہیں۔سید کرامت علی بشر، پربھو لال گوڑ،، پنڈت سروپ نارائن ایمن، پنڈت چاند نارائن راز داں مونس، پروفیسر مبتدی رہبر، گویا قریشی، حسرت قریشی، محمود زکی، کاشف الہاشمی، سحر اجینی سے چلتا ہوا یہ سلسلہ عصر حاضر میں پروفیسر صادق اور رشید امکان تک پہنچتا ہے۔

کرامت علی بشر جنہیں فخر مالوہ کا خطاب دیا گیا۔وہ ایک سنجیدہ شاعر کے طور پر اپنی شناخت قائم کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے اشعار میں طنز کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

پنڈت چاند نارائن مونس جو کہ 1885 میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم امرتسر مدرستہ المسلمین سے حاصل کر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور اور پھر لندن گئے وہاں سے واپس آنے کے بعد ریلوے میں اسسٹنٹ ٹرافک سپرنٹنڈنٹ ہوئے پہلے گوالیار پھر اجین میں مقیم ہوئے اور

آخر دم تک یہیں سکونت اختیار کی۔

مونس کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا اپنے بڑے بھائی سے اصلاح لیتے تھے ان شعری مجموعہ' کلام مونس' کے نام سے سلطان احمد صدیقی نے مرتب کیا۔اس مجموعے میں غزلوں نظموں اور قطعات کے ساتھ مزاحیہ نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں شادی ،میاں بیوی اور دھوبن ،شکوہ امیدوار سسٹم نمائندہ مزاحیہ نظمیں ہیں۔

نظم 'میاں بیوی اور دھوبن' دیکھیے جس میں شوہر کی سادگی کو موضوع بنایا گیا ہے

صبح دم جب چلے میاں دفتر
مجھ سے کہنے لگے یہ جھنجھلا کر
توڑ لاتی ہے سب بٹن ہر بار
ایسی دھوبن پہ ہو خدا کی مار
سب بٹن اب کہ توڑ لائی ہے
انتہا کی اسے ڈھٹائی ہے
دھوپ آتے ہی دیکھ ڈالو اگر
کوئی شکوہ رہے نہ کوئی کسر
میں نے سوچا کہ ماجرا کیا ہے
کوئی جادو ہے یا تماشہ ہے
کل بٹن ٹانکتی رہی دن بھر
رات میں کس کا چل گیا منتر
میں نے دیکھا ادھر جو حیرت سے
میاں الٹی قمیص پہنے تھے

بے روزگاری ایک ایسا سنجیدہ موضوع ہے جس پر شعرا نے نظمیں لکھی ہیں لیکن اس موضوع پر طنز کے ساتھ مزاح کا پہلو بھی اجاگر کرنا کمال ہے۔مونس اپنی نظم شکوہ امیدوار سسٹم' میں سرکاری نظام پر گہرا طنز کرتے ہیں کہ یہاں سفارش اور رسوخات کے بنا نوکری پانا ناممکن ہو گیا ہے۔ قابلیت کی کوئی قدر نہیں ہے نوکری پانے کے لیے کسی آفیسر کا بیٹا ہونا یا کسی رسوخ دار انسان کی سفارش کروالینا ہی سب سے بڑی قابلیت ہے۔ایک اور نظم 'شادی' عنوان سے ہے۔شاعر ایک ایسی ملازمت میں ہے جہاں اسے بار بار دورے پر جانا پڑتا ہے ایسے میں وہ شادی نہیں کرنا چاہتا اور اپنا جواز مزاحیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں شادی کیجیے
ہم یہ کہتے ہیں کہ رہنے دیجیے

اپنی مصروفیت بتا کر آخر میں کہتے ہیں

جب کہیں پر ہم کہیں پر 'یار' ہو
ایسی شادی پر خدا کی 'مار' ہو

مونس کے یہاں متفرق اشعار میں طنز کا پہلو نظر آتا ہے دوستوں کے تعلق سے کہتے ہیں

دوستوں سے ہم کو اتنے آر تھک جھٹکے لگے
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
افسروں کی من مانی پر لکھتے ہیں
قاعدے قانون کاغذ پر لکھے رہ گئے
خرچ ناجائز کیا دل میں جو آتا رہا
ساتھیوں نے جب ٹوکا تو ہم نے کہہ دیا
جو مناسب ہم نے سمجھا وہ تو سب کچھ ہو چکا

مونس سماج میں پھیلی برائیوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

عظیم خاں عظیم کا شمار بھی اجین کے ابتدائی شعرا میں کیا جاتا ہے گو کہ ان کی شاعری گنجلک ہے،مگر کہیں کہیں ظریفانہ انداز نمایاں ہے۔عظیم خاں عظیم کی کرامت علی بشر سے شاعرانہ چشمک چلتی تھی۔وہ طنز کے تیر بھی ان پر برساتے رہتے تھے افسوس ان کا کلام اشاعت کے مرحلے سے نہ گزر سکا چند اشعار دیکھیے

بوسہ لب ہائے شیریں لے کے کھالیں گالیاں
ساتھ شیرینی کے ہم کو چیز کھاری چاہیے

آزادی کے پہلے اجین میں شعراء کی تعداد تو بہت ملتی ہے لیکن شاعری میں سنجیدگی کا پرتو زیادہ نظر آتا ہے جو کہ اس دور کے حالات کے باعث ہوسکتا ہے۔آزادی کے بعد بھی ایک عرصے تک شعری ماحول پر سنجیدگی ہی طاری دکھائی دیتی ہے جس کی واضح وجہ ملک کی تقسیم کا سانحہ اور ہجرت ہے۔ایک عرصے کے بعد جب ماحول سازگار ہوتا ہے اور زندگی ترنگ میں آتی ہے تو اردو کی بقا کے لیے چند محبان اردو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن میں نمایاں نام محمود ذکی، حکیم ضیا احمد اور قمر اجینی کا آتا ہے جنھوں نے 'بزم ادب' قائم کی اور انجمن ترقی اردو کی شاخ کو بھی اجین میں قائم کیا۔ ان کوششوں اور کاوشوں نے اردو کو توانائی عطا کی تو یہاں کے شعرا کا انداز بھی بدلنے لگا اور شعرا کے یہاں طنز و مزاح کے نشتر دکھائی دیتے ہیں۔ کاشف الہاشمی ، رحیم بخش رحیم ،راہی عنایتی ،اعجاز شمس ، پرفیسر صادق ، پروفیسر عتیق اللہ ، احمد کمال پروازی ،سحر اندوری ، رشید امکان، سحر اجینی وغیرہ۔ان شعرا میں رشید امکان اور پروفیسر صادق سرفہرست ہیں۔

اجین ہی کی معروف ادیبہ بشریٰ ناہید کا ایک انتخاب 'منتخب طنز ومزاحیہ نظمیں' کے عنوان سے جوادبی دنیا، اردو بازار دہلی سے منظر عام پر آیا جس کے متعلق بشریٰ ناہید لکھتی ہیں۔

''اس انتخاب میں پابند نظموں کے ساتھ ہی آزاد نظموں کو بھی نمائندگی دی گئی ہے۔اور دور حاضر کے تقریباً سبھی طنز ومزاح نگار شعرا کی تخلیقات شامل ہیں''۔

('منتخب طنز ومزاحیہ نظمیں۔ص۔6)

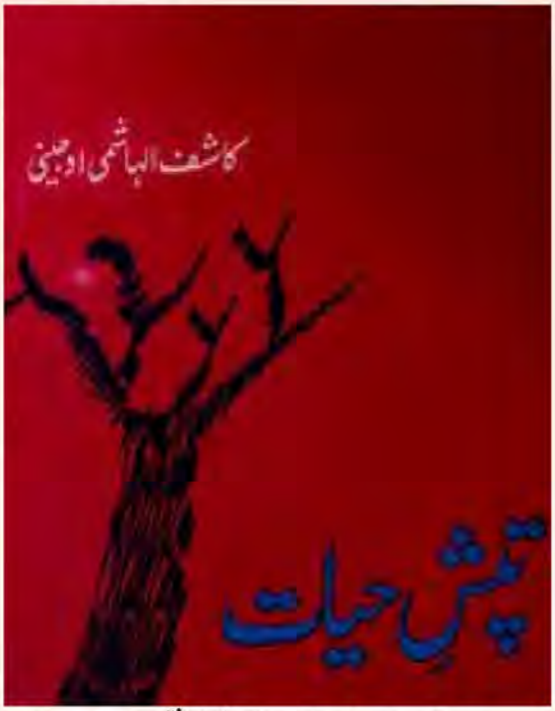

اس انتخاب میں اجین کے چند شعرا کی بھی نظمیں شامل ہیں، ایک نظم کاشف الہاشمی کی 'تعارف عنوان سے ہے'۔کاشف الہاشمی نام سید ولایت علی ہاشمی ہے لیکن وہ اپنے قلمی نام کاشف الہاشمی سے ہی جانے جاتے ہیں۔ان کا مجموعہ کلام 'تپش حیات' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ان کی رباعیات کا مجموعہ بھی 'حرف تسکین' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔کاشف الہاشمی نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعری بھی کی۔ان کی نظم 'تعارف' کے چند بند پیش ہیں:

آج ایک نظم پیش کرتا ہوں
نام اس نظم کا تعارف ہے
اس کا ہر لفظ بے محابا ہے
اس کا ہر بند بے تکلف ہے

لیجیے پہلے آپ سے ملیے
کاشف الہاشمی ہے آپ کا نام
آپ ہیں بدمزاج و بد اخلاق
آپ کی دوستی کو سات سلام

اس طرح وہ پوری نظم میں مختلف شعرا کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

احمد کمال پروازی جن کا تخلص کمال ہے۔ان کے تین شعری مجموعے 'مختلف (1988)، برقرار (2005)اور تیسرا مجموعہ 'چاندی کا ورق' بعد از مرگ ان کے عزیز دوست ڈاکٹر ضیا رانا اور عبدالحمد گوہر نے 2009 میں شائع کیا۔کمال کی غزلوں میں سیاسی، سماجی صورت حال اور دیگر حالات حاضرہ کے موضوعات پر طنز ملتا ہے۔چند متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے:

بس اک نعرہ ہمارے خلاف لکھ دیجیے
یہ لوگ آپ کو مسند نشین کر دیں گے
یہ لوگ یونہی چکرورتی بیاج لیتے رہے
تو اک روز ہمیں بھی ذہین کر دیں گے

اجین کی مزاحیہ شاعری میں اہم نام رشید امکان کا ہے۔رشید امکان نے اپنی شاعری کی ابتدا تو رشید امکان ک نام سے ہی کی لیکن پھر وہ صاحب امکانی بن گئے۔رشید امکان سے صاحب امکانی بن جانے کے سفر کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

''رشید امکان سے صاحب امکانی کی جون میں کیسے آگیا۔ بس آگیا ۔۔۔۔۔اپنے اردگرد بڑی غلط کاریاں ہوتے دیکھیں۔دنیا بہت سنگ دل ہوتی جا رہی ہے، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔۔۔۔جھوٹ، مکر، دھوکہ، لوٹ کھسوٹ، بے ایمانی حق تلفی لوگوں کا ایمان بن چکی ہے۔۔۔۔۔یہ اذیت ناک صورت حال میرے سامنے تھی جس نے مجھے طنز کے لیے اکسایا۔سنجیدہ شاعری میں ان پر کاری وار کرنا آسان نہ تھا، طنز کو گوارہ بنانے کے لیے مزاح کی چاشنی ضروری تھی تاکہ سامع توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سن سکے، سو میں مزاحیہ شاعری کی طرف مڑ گیا۔''

(پانی بھرے ہے دن کا اجالا مرے آگے ،ص۔11۔12)

صاحب امکانی کی طنزیہ مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ''پانی بھرے ہے دن کا اجالا مرے آگے'' کتابی دنیا دہلی سے 2013 میں شائع ہوئی جسے انھوں نے نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے نام معنون کیا ہے۔اپنے مجموعے کے سرنامہ پر وہ یہ شعر رقم کرتے ہیں

چشمہ لگا کے دیکھے ہے دن، میری آب و تاب
پانی بھرے ہے دن کا اجالا میرے آگے

صاحب امکانی نے اپنی طنزیہ شاعری کو پیش کرنے کے لیے غالب کی غزلوں کو پیروڈی کی شکل میں بیان کیا ہے۔ غالب کی غزلوں کی زمین میں بڑی دلچسپ شاعری کرتے ہیں۔ ان کے اشعار ان کی گہری فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ موجودہ دور کے ذہنی اور سماجی، سیاسی انتشار کو وہ اپنا موضوع بناتے ہیں۔

زہر ہی ہوگا یہ ، دوا کیا ہے
آپ اپنے ہیں ، دیکھنا کیا ہے

دے رہا ہوں دعا رقیبوں کو
کچھ دنوں سے مجھے ہوا کیا ہے

غالب کی غزل کا یہ حشر دیکھیے

آم اب تک تو کسی شاخ پہ املی نہ ہوا
وہ مرے، خواب میں آنے پہ بھی راضی نہ ہوا
بن گیا اس کے، بہر کیف، گلے کی ہڈی
وہ چبا جاتا مجھے، خیر سے مولی نہ ہوا

عشق میں آپ کے اللہ کا احساں ہے کہ میں
پاگل ہونا تو بہت دور ہے سنکی نہ ہوا

اجین کے شعرا میں طنز و مزاحیہ نگار کی حیثیت سے پروفیسر صادق کا نام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر صادق کی شاعری کی ابتدا ہی ہزلیہ شاعری سے ہوتی ہے، پھر وہ سنجیدہ شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ پروفیسر صادق کاذب مالوی، مولا بخش، صادق ناموں سے شاعری کرتے رہے ہیں۔

'غالب کے نام ایک خط' نظم کاذب مالوی کے نام سے بشریٰ ناہید کے انتخاب 'منتخب طنز و مزاحیہ نظمیں' میں ملتی ہے جس پر تاریخ 7، رجب 1380 ہجری درج ہے۔ نظم کا عنوان ہے

''غالب کے نام ایک خط''

محترم اور مکرم چچا مرزا غالب
آپ کا نامہ ملا آج بنام کاذب
اس میں تحریر تھا کچھ شعر و سخن کا لکھو
سن کے افسوس تو ہوگا چچا لیکن سن لو
دور حاضر میں یہاں شعر و سخن ہیں بسمل
ہوگئی شاعری اک طرح 'فری اسٹائل'

اسی نظم میں آگے وہ نئی نظم کے متعلق بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ غزل سے لوگ بیزار ہیں اور نظم کے انبار لگا رہے ہیں جن میں راشد، جعفری، مخدوم وغیرہ شامل ہیں۔ ساتھ ہی یہاں پیروڈی کا بھی بول بالا ہے، آپ ناراض نہ ہوں میں آپ کے شعر کی بھی پیروڈی لکھ دیتا ہوں

نوکری دینے پہ کوئی مجھے راضی نہ ہوا
یہ ہے وہ لفظ جو شرمندہ ''معنی نہ ہوا''

پھر غالب کو وہ اس دور میں اہمیت بتاتے ہیں کہ آپ کا کلام ہندی اردو دونوں میں شائع ہوتا ہے اور ریڈیو پر بھی سنائی دیتا ہے۔

بعد از مرگ محترم کا مقام اچھا ہے
لوگ کہتے ہیں کہ غالب کا کلام اچھا ہے
مفلسی اور غریبی پہ نہ اپنی روتے
بخدا آپ جو اس دور میں پیدا ہوتے
والسلام ۔آپ کا اپنا ہی بھتیجا ۔کاذب

پروفیسر صادق کی بیشتر طنزیہ مزاحیہ شاعری اردو اور ہندی کے مختلف رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہوتی رہی ہے۔ ان کا مطالعہ قاری کو موضوعات کی رنگینی اور اسلوب کی دلکشی کے باعث ایک فرحت اور شگفتگی کا احساس ہی نہیں کراتا بلکہ بہت کچھ سوچنے پر بھی مائل کرتا ہے۔

المختصر اجین میں طنز و مزاح کی روایت بہت مختصر سہی لیکن جاندار ہے، ان میں زندگی کے گوناگوں مسائل کی عکاسی بڑے لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے جو باشعور قارئین کے ذہن کو دل کو نہ صرف محظوظ کرتی ہے، بلکہ غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہے اور اصلاح کرنے کی ترغیب بھی دلاتی ہے۔

□□□

Dr. Ishrat Naheed
Asst. Professor
Maulana Azad National Urdu University
Lucknow Campus
504/122 Tagor Marg,
Near Shabab Market, Daliganj
Lucknow-226 020 (U.P.)
Mob 09598987727
ishratnahid@gmail.com

ڈاکٹر ناز بیگم

’ہم سفر‘

آپ بیتی جگ بیتی

اردو کے مشہور ادیب، نقاد، مفکر اور مترجم اختر حسین رائے پوری کی اہلیہ حمیدہ اختر کی آپ بیتی ’’ہم سفر‘‘ اردو کی منفرد و ممتاز تصنیف ہے۔ یہ تصنیف 1995 میں شائع ہوئی۔ قبل اس کے کہ حمیدہ اختر کی تصنیف ہم سفر کا تفصیلی جائزہ لیا جائے مصنفہ کے متعلق چند باتیں تصنیف کے جائزہ میں معاون ہوں گی۔

حمیدہ اختر کی پیدائش 2 نومبر 1918 میں اتر پردیش کے شہر علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام ظفر عمر تھا۔ اردو کا پہلا جاسوسی ناول ’’نیلی چھتری‘‘ اور ’’لال کھنڈر‘‘ کے مصنف ظفر عمر اپنے زمانے کے مشہور ناول نگار اور سپرینٹیڈ ینٹ پولس تھے۔ ظفر عمر کے یہاں دو بیٹے شوکت عمر، زاہد عمر اور چھ بیٹیاں منور بیگم، محمودہ بیگم، حمیدہ عمر، خدیجہ، رشیدہ اور ذکیہ ہوئیں۔ حمیدہ عمر پانچویں نمبر پر تھیں۔ ظفر عمر صاحب کی رہائش علی گڑھ سول لائین میں چنگی کے پاس نواب آفتاب احمد صاحب کے مکان کے پشت پر تھی۔ انھوں نے یہاں اپنا مکان 1925 میں تعمیر کرایا اور اس کا نام اپنے مشہور ناول کے نام پر ’’نیلی چھتری‘‘ رکھا۔ حمیدہ اختر کا بچپن اسی نیلی چھتری میں بڑے عیش و آرام سے گزرا۔ اس مکان میں ظفر عمر کی اولاد کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے۔ اپنے مکان اور افراد کے متعلق حمیدہ اختر فرماتی ہیں:

’’نیلی چھتری درحقیقت ایک چھوٹا سا محلّہ تھا۔ اس میں صرف ان کی (ظفر عمر) اولاد ہی نہ رہتی تھی، بلکہ دس بارہ چچا، ماموں اور خالاؤں اور والدین کے دوستوں کے لڑکے جن کو ہوٹل سے ان کی شرارتوں نالائقیوں کی وجہ سے نکالا مل جاتا۔ وہ نیلی چھتری کے بورڈنگ ہاؤس میں جگہ پا لیتے۔ دو سال کے لئے مولانا محمد علی کے نواسے خالد علی اور مولانا شوکت علی کے پوتے اور مولانا محمد علی کے نواسے طارق علی جانے کس جرم کی پاداش میں بورڈنگ سے نکل کر ہمارے یہاں پہنچ گئے تھے۔‘‘ (ہم سفر، حمیدہ اختر، ص 9)

اس سے ظفر عمر اور ان کے خاندان کے باہم محبت اور مکان کے مکینوں کے آپسی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ سب دیکھنا تو دور سننے میں بھی نہیں آتا۔ خاندان کی اسی شفقت اور محبت سے متاثر ہو کر اشرف، ذکاء اللہ، اختر حسین رائے پوری (یہ سب امیر منزل میں رہتے تھے) سید حسن اور مجاز ایک ٹولی بنا کر اکثر راتوں کو نیلی چھتری کے پاس سے گزرتے ہوئے عجیب و غریب لیکن نہایت پرلطف گانے گاتے تھے۔ ایک گانے کے بول ملاحظہ ہوں:

’’اللہ میاں خوب بنی تیری شان

سب بی بین میں یکو بی بی وہ بی بی فاطمہ
سب کتابن میں یکو کتاب بنائی
اللہ میاں وہ بھی کتاب قرآن
ساری چھتوں میں یکو چھپر چھوایا
اللہ میاں تونے بنایو آسمان
سب برتن میں یکو برتن بنایا وہ بھی برتن پان دان
سارے خاندان میں ایک ہی خاندان
اللہ میاں تونے بنایا عمر خاندان''

(ہم سفر، حمیدہ اختر ص34)

حمیدہ کی شادی اختر حسین رائے پوری سے 30 دسمبر 1935 میں ہوئی۔ اختر کا تعلق رائے پور سے ہے۔ ان کے والد کا نام سید اکبر حسین تھا۔ اختر کے آباؤ اجداد شہنشاہ ہمایوں کے زمانے میں ایران سے آکر دلی میں مقیم ہو گئے۔ پھر خاندان پٹنہ میں بس گیا۔ اختر کے والد ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصے تک رائے پور میں رہے۔ بالآخر انھوں نے بھی پٹنہ میں آکر سکونت اختیار کی۔

اختر کی والدہ کا نام ممتاز النساء تھا۔ ممتاز النساء سکتی ریاست کے دیوان (پرائمنسٹر) نواب برہان الدین کی نواسی تھیں۔ ممتاز النساء کی والدہ (اختر حسین رائے پوری کی نانی) کی شادی بیرسٹر رائے بہادر سر آسو توش بینز جی، جو کافی عرصہ کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، کے اکلوتے بیٹے بیرسٹر تارا چند بینز جی سے ہوئی۔ تارا چند بیر جی کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی بنگلہ اور انگریزی زبان کی مشہور شاعرہ اور سحر بنگالہ، پریم بدا دیوی سے ہوئی تھی۔ تارا چند بینر جی اپنی دوسری شادی کے وقت مسلمان ہو گئے تھے اور تارا چند سے بدر الدین ہو گئے۔ ان کے دو اولاد ہوئیں۔ حبیب الدین اور ممتاز النساء۔ حبیب بینر جی، جن کو سحر بنگالہ پریم بدا نے گود لے لیا تھا، سیکریٹری گورنر سی پی رہے۔ ممتاز النساء سے دو بیٹے مظفر حسین اور اختر حسین پیدا ہوئے۔ ابھی اختر تین برس کے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ مرحومہ اپنے پیچھے کافی جائداد چھوڑ گئی تھیں۔ لیکن جب اختر 15 برس کے تھے کہ کسی بات سے والد صاحب سے ناراض ہو گئے اور سب کچھ چھوڑ کر علم کی جستجو میں کلکتہ نکل گئے۔ وہاں سے علی گڑھ آئے اور امیر منزل میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ اختر اور حمیدہ کی ملاقات یہیں امیر منزل میں ہوئی تھی۔ بالآخر اس ملاقات نے دونوں کو رشتہ مناکحت میں باندھ دیا۔

''ہم سفر'' حمیدہ اختر نے اپنے شوہر کے انتقال 1992 کے بعد لکھی۔ بہتر (72) برس کی عمر میں لکھی گئی یہ ان کی پہلی تصنیف ہے جو خود حمیدہ اختر کے بیان کے مطابق پہلے رسالہ "افکار" میں قسط وار شائع ہوئی۔ بعد میں 1995 میں کراچی سے شائع ہوئی۔

ایک گھریلو خاتون جس کی زندگی کا مقصد بچوں کی تربیت اور شوہر کی پروانہ وار رفاقت تھا۔ ان کے قلم سے "ہم سفر" کا وجود اردو ادب کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ روز مرہ کی ٹکسالی زبان میں لکھی گئی اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے۔ یہ نہ صرف حمیدہ اختر کی آپ بیتی ہے بلکہ اختر حسین کی آپ بیتی ''گرد راہ'' کی نامکمل باتوں کی تکمیلہ اور اجمال کی تفصیل بھی ہے۔ "ہم سفر'' میں حمیدہ اختر نے اپنے نامور شوہر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی روداد بیان کی ہے ساتھ ہی ایک وسیع دنیا کی سیر کرائی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اور اختر کے خاندان کے متعلق جگہ جگہ جو دلچسپ واقعات بیان کئے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ''ہم سفر'' میں حمیدہ نے شادی سے قبل اختر سے اپنی غائبانہ ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ''ہم سفر'' اس حیثیت سے بھی بہت اہم ہے کہ اس کتاب میں اہم شخصیات کا تذکرہ ہے غرض اس کتاب کو شخصیات کا نگار خانہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

مولوی عبدالحق صاحب کی جو تصویر اس کتاب میں پیش کی گئی ہے اس سے مولوی صاحب ایک سنجیدہ عالم محقق' زبان داں کے بجائے ''کھلنڈرے مولوی صاحب'' (ہم سفر، حمیدہ اختر، بہ کتاب ص15) نظر آتے ہیں۔ مثلاً کہیں باراتیوں کے ساتھ مزاحیہ گیت گا رہے ہیں، کہیں چہرہ بگاڑ کر بچوں کو ڈرا رہے ہیں، کہیں بیڈمنٹن تاش اور پچیسی کھیلتے ہوئے بچوں کی طرح جھگڑ رہے ہیں اور کہیں اختر کے ساتھ عجیب وغریب قسم کی بیت بازی ہو رہی ہے۔

حمیدہ اختر نے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے ان کے ساتھ ایک سال کا عرصہ گزارا بعد میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ حمیدہ صاحبہ نے اپنی تصنیف میں عبدالحق صاحب کی بڑی نادر تصویر کھینچی ہے۔ عبدالحق صاحب کی یہ تصویر اس کتاب کے سوا دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتی۔ گاندھی جی کی شخصیت کا بھی ایک ایسا پہلو پیش کیا گیا ہے جو صرف ''ہم سفر'' میں نظر آتا ہے۔ گاندھی جی ہندو مسلم یکجہتی اتحاد کے خواہاں اور مسلمانوں کے ہمدرد تھے لیکن حمیدہ اختر نے اپنی اور گاندھی جی کی جو گفتگو نقل کی ہے، اس سے گاندھی جی کی بالکل الگ تصویر نظر آتی ہے۔

حمیدہ اختر نے ہم سفر میں ملک اور بیرون ملک کا سفر بھی کرایا ہے۔ حیدر آباد، پیرس، صمالیہ، ایران، یوگینڈا، تنزانیہ، کینیا وغیرہ کے اہم مقامات، طرز زندگی، تہذیب وتمدن، جانوروں، ان کی طرز زندگی، قدرتی

مناظر، ایرانی عورتوں کی خوبصورتی وغیرہ کا بیان تفصیلی اور دلچسپ ہے۔
شادی کے چند روز بعد حیدرآباد کے نواب منظور یار جنگ کے یہاں بیس روز کے قیام کے دوران حمیدہ اختر نے نوابوں کی طرز زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کا بیان بڑی جزئیات کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً نواب منظور یار جنگ کی صاحبزادی منیر بانو جو حمیدہ کی ہم عمر تھیں، ان کے نازنخرے اور نزاکت و نفاست کا بیان حمیدہ اختر نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ منیر بانو کی مکتب سے واپسی کا ایک منظر دیکھیے:

''موٹر کا ہارن بجا۔ پاشی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے کمرے میں آئیں۔ کئی لوگوں کے قدموں کی آواز گیلری سے برآمدے میں جاتی محسوس کی۔ مجھ سے کہا ''آؤ اختر دلہن، منیر با نو آگئیں''، پلنگ سے اٹھ کر ان کے ساتھ برآمدے میں آئی۔ تین عدد باندیاں وہاں کھڑی تھیں۔ موٹر پورچ میں آکر رکی۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا، ایک نے بستہ پکڑا۔ موٹر سے منیر بانو سانولی رنگت والی نازک بدن اور مناسب قد، ان کا پاؤں موٹر سے بڑی ادا کے ساتھ باہر نکلا پھر خود نمودار ہوئیں۔ حیدرآبادی جوڑا جس کا دوپٹہ پانچ میٹر ہوتا ہے۔ بیل ٹکا ہوا دوپٹہ، لمبی سی موٹی چوٹی موباف پڑی شانے پر ڈھلک آئی تھی۔ سر کو ایک بڑی ادا سے جھٹکا دے کر اس کو پیچھے کیا۔ ایک باندی نے بستہ ہاتھ میں تھام لیا۔ سیڑھی چڑھ کر برآمدے میں جیسے ہی قدم رکھا ایک باندی نے دوپٹہ شانوں پر سے ہاتھ میں یوں لے لیا کہ صبح سے اب تک شانے تھک گئے ہوں گے۔ پاشی نے بڑھ کر چٹ پٹ بلائیں لیں۔ پھر ہم دونوں کو ملایا ہم گیلری سے منیر کے کمرے میں آئے۔ اب میں نے عجب تماشا دیکھا کہ منیر بانو صاحبہ آڑی آڑی پلنگ پر یوں لیٹ گئیں جیسے میلوں پیدل چل کر آرہی ہوں۔ دو باندیوں نے ان کے جوتے اتارے، ایک جھٹ چاندی کا تسلہ پاؤں کے پاس لے کر آئی۔ دوسری چاندی کا لوٹا۔ تسلہ ایک نیچے سے اسٹول پر رکھ دیا گیا اور اب گرم پانی سے ان کے پاؤں دھلائے۔ پھر لوٹے کا سب پانی تسلے میں ڈال کر صاحب زادی کے دونوں پاؤں ٹخنے تک پانی کے اندر رکھے گئے۔ ایک باندی پاؤں پر مساج کرنے لگی کہ تھکاوٹ اتاری جائے۔ اب ایک لونڈی نے چاندی کا وہ گول طشت جو پاشی کے کمرے میں دیکھ چکی تھی سر پوش اٹھا کر ان کے قریب کیا اور پوچھا آپ شربت پئیں گی؟ سر جھٹک کر بولیں ''نہیں''۔ پھر انار کے دانے؟ ''نہیں''، تو پھر کم سے کم سنترے کا زیرہ تو کھالیں۔ ''اچھا'' ہاتھ بڑھا کر دو چمچے منہ میں ڈال ہاتھ سے طشت کو پرے ہٹادیا۔ ''بس لے جاؤ'' (ہم سفر، حمیدہ اختر ص120)

اسی طرح منیر بانو کے غسل کے قبل اور بعد کی تیاری اور آداب بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ وہ منیر بانو ہیں جو اب حیدرآباد میں ایک درمیانے طبقے کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ حمیدہ اختر نے "ہم سفر'' میں حیدرآباد کی تہذیب وتمدن، طور طریقے، لباس، زیورات محلوں اور عمارتوں کا نقشہ، وہاں کے ساز و سامان اور چھوٹے چھوٹے رسم و رواج کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ قاری خود کو نصف صدی پیچھے محسوس کرتا ہے۔ تہران میں سید رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی کے موقع پر پورے شہر کی آرائش اور روشنی کی سجاوٹ کا بیان قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایران کے بادشاہ کی ڈھائی ہزار سالہ جشن ''پارسی پولس'' شہر شیراز سے دس بارہ میل پہلے آثار قدیمہ میں منایا گیا۔ اس موقع پر آثار قدیمہ کے کھنڈرات، ڈھائی ہزار سال پہلے کے انداز سے سجایا گیا اس شاہی جشن کا بیان جس تفصیل اور باریک بینی سے کیا گیا ہے دوسری جگہ نظر نہیں آتا ہے۔ ہم سفر کی زبان مروجہ ادبی زبان نہیں بلکہ روزمرہ کی ٹکسالی زبان ہے۔ باوجود اس کے زبان میں وہ جاذبیت روانی اور خوش آہنگی ہے کہ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اس کو پڑھتے وقت قاری محسوس کرتا ہے کہ قصہ خواں قصہ سنا رہا ہے۔ حمیدہ اختر منظر نگاری اور شخصیت کی تصویر کشی میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ گاندھی آشرم، وہاں کی کٹیا کا اندرونی منظر اور گاندھی جی کی شکل وصورت کا نقشہ فنکارانہ ہے۔

''ہم سفر'' اپنی نادر معلومات، واقعات، زبان واسلوب کے اعتبار سے اردو ادب میں ایسا نمونہ پیش کرتی ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

□□□

Dr. Naaz Begum
Assistant Professor, Urdu
In-charge Urdu Section,
Mahila Mahavidyalaya,
B.H.U., Varanasi221005 (U.P)
Mob. 6393494760
nazb985@gmail.com

ڈاکٹر محمد رضا

ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں عورت کا کردار

اردو افسانے میں عورت کا کردار ہمیشہ سے ایک بحث طلب موضوع رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کردار میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں، لیکن روایتی طور پر عورت کو مختلف کرداروں میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ابتدائی اردو افسانوں میں عورت کو اکثر مظلوم اور بے بس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ وہ سماجی برائیوں اور مردوں کے ظلم کا شکار ہوتی تھی۔ ایک عورت کو گھر کی نگہبان کے طور پر بھی پیش کیا جاتا تھا۔ ایسی عورت کا کردار صرف گھر تک محدود رہتا تھا۔ آج کل کے اردو افسانوں میں عورت کو ایک آزاد اور خود مختار شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ مختلف کرداروں میں نظر آتی ہے اور سماج میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ جدید افسانے میں عورت کے ذریعے سماجی مسائل کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً خواتین کے خلاف تشدد، تعلیم کی کمی اور ملازمت کے مواقع کی کمی وغیرہ۔ عورت کے مختلف کرداروں نے اردو افسانے کو مزید متنوع اور دلچسپ بنادیا ہے۔ تاہم، روایتی کرداروں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ ہمارے ادبی ورثے کا ایک اہم حصہ ہیں۔

اردو ادب میں خواتین کے لکھنے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب سرسید تحریک عروج پر تھی۔ اس بابت قمر رئیس رقمطراز ہیں:

''اردو نثر میں خواتین نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب سرسید کی اصلاحی تحریک اپنے شباب پر تھی اور مسلم معاشرہ میں متوسط طبقہ آنکھیں کھول رہا تھا۔ نذیر احمد کے ناول، حالی کی مجالس النسا اور راشد الخیری کے قصے عورتوں کی تعلیم اور تہذیب پر زور دے کر، گھروں کے اندر سہی، مسلم خواتین میں ایک ذہنی بیداری پیدا کر رہے تھے۔ اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جب خاتون تہذیب نسواں اور عصمت جیسے رسالے شائع ہونا شروع ہوئے تو بقول قرۃ العین حیدر ان کے اثر سے ''معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے دیکھتے انھوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنا شروع کردیئے، ابتدائی دور کی ان خواتین ناول نگاروں میں رشید النسا (ناول اصلاح النسا) محمدی بیگم (ناول شریف بیٹی وغیرہ) اکبری بیگم (ناول گودڑ کا لال وغیرہ) نذر سجاد حیدر اور حجاب امتیاز علی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔''

(اردو میں خواتین کا ادب، خطبۂ صدارت، پروفیسر قمر رئیس، جنوری 2003، ص 3)

اس وقت کی خاتون افسانہ نگاروں میں ثروت خان، نگار عظیم، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری اور ذکیہ مشہدی قابل معتبر خواتین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ ذکیہ مشہدی اردو افسانے کی ایک منفرد آواز ہیں، جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے اردو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ انھوں نے عورت کی نفسیات، سماجی صورتحال اور معاشرتی مسائل کو بڑے حساس انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریریں اپنے منفرد انداز اور گہری بصیرت کی وجہ سے قارئین کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ ذکیہ مشہدی نے عورت کی نفسیات کو بہت گہرائی سے سمجھا اور اپنے بیشتر افسانوں میں اسے خوبصورتی سے پیش کیا۔ انھوں نے عورت کے اندرونی جذبات، کشمکش اور

تضادات کو بڑی سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت کے سماجی مسائل کو بہت کھل کر پیش کیا۔ ساتھ ہی عورت کی آزادی، حقوق اور معاشرتی پابندیوں کے خلاف بھی زبردست آواز اٹھائی۔ وہ ایک افسانہ نگار کے صفات کو بیان کرتے ہوئے ''نقش تمام'' (2008) میں رقمطراز ہیں:

''میرا خیال ہے کہ کامیاب افسانہ نگاری کے لیے حساس دل، وسیع تجربے اور الفاظ پر قدرت یہ تینوں ضروری ہیں۔ حساس دل تو میرے پاس ہے لیکن تجربہ بہت وسیع نہیں ہے۔ جہاں تک الفاظ کا سوال ہے اس کا فیصلہ قارئین پر ہے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ ان تک پہنچ سکا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے کسی بھی مصنف کی کامیابی یا ناکامی کا ایک ذہین قاری سے زیادہ بہتر جج اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

(افسانوی مجموعہ، پرائے چہرے، ذکیہ مشہدی۔ لیبل آرٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ 6، جولائی 1984، ص 7)

ان کا افسانوی مجموعہ ''نقش ناتمام'' اردو میں مشہور ہے۔ اس کا ایک افسانہ ''ہدّ و کا ہاتھی'' ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اس میں افسانہ نگار ذکیہ مشہدی نے نسوانی کردار ہدّ و کی بیوی کا انداز بہت شاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ ہدّ و ایک فیل بان ہے۔ جب کہیں جلسہ جلوس ہوتا ہے تو اس کے ہاتھی کو لوگ استعمال کرتے ہیں وہ اسی سے روزی کماتا ہے مگر اتنا اس سے کمائی نہیں ہو پاتی۔ جس سے اس کے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ اس لیے اس کی بیوی چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا ہنر سیکھ لیتے مگر وہ یہ کام اس کے دادا پر دادا کرتے آئے ہیں۔ اس لیے وہ اس کام کو نہیں چھوڑتا ہے۔ اس کی بیوی نہیں چاہتی ہے اب اس ہاتھی کی دیکھ ریکھ کی جائے۔ اس لیے جب ہدّ و اپنے ہاتھی کو چار عدد دستی روٹیاں اور کوئی پانچ سات حلوے کی قتلیاں کھلا دیتا ہے تو وہ اس پر برہم ہوجاتی ہے۔

اس افسانے میں عورت کا کرداریوں بیان کیا گیا ہے:

''تمھارے دادا پر دادا کو بھی کچھ اور نہیں ملا تھا کرنے کے لیے۔ بھلا بتاؤ سادات اور فیلبانی۔، بیوی نے پھر جل کر منہ مارا۔''

بہت دن گزر چکے تھے۔ لیکن ہدّ و کی بیوی کو ہاتھی کی روٹیاں اور حلوے نہیں بھولے تھے۔ ایک دن اچانک ہدّ و کے گھر حادثہ ہوجاتا ہے اور ایسا حادثہ جو اسکو فلک سے زمین پر گرادیتا ہے۔ ہوا یہ کہ ہاتھی ایک دن مرجاتا ہے۔ اب ہدّ و جو تھورا بہت پیسے کما لیتا ہے اس سے بھی محروم ہوجاتا ہے اور فیل بان سے رکشہ والا بن جاتا ہے۔ کاش اس کی بیوی جو اس ہاتھی کے زندہ رہنے پر اچھے سے گزر بسر کررہی تھی، اگر اس کے کھان پان پر دھیان دیتی اور ہدو کو جو اکثر ہاتھی کو لے کر لڑائی کرتی تو اسے آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتے۔

اس میں ضمناً ایک کہانی یہ ہے کہ افسانہ نگار نے چودھویں صدی کے آخری حالات کو جب دہلی کے مرکز کو کمزور پا کر جس نے جہاں چاہا وہاں سلطنت بنالی۔ اس طرح سلطنت جون پور بھی وجود میں آئی جو سلاطین الشرق ملک سرور خواجہ جہاں جو فیروز شاہ کے وقت میں ہی مشرقی علاقوں کے گورنر بنائے گئے تھے اور باوجود خواجہ سرا تھے، لیکن لائق انسان تھے۔ انہوں نے صرف پانچ برس میں جون پور کو دارالسرور بنادیا تھا۔ آگے چل کر شاہجہاں نے اسے شیرازِ ہند کے لقب سے نوازا۔ اس وقت قلعہ فیروز شاہی میں ہاتھی گھوڑوں کی ریل پیل تھی۔

ذکیہ مشہدی کا یہ افسانہ جہاں ایک ہدّ و اور اس کی بیوی کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے، وہیں قدیم شاہی زمانے میں ہاتھی کی اہمیت اور اس کی عظمت اور راجہ کے جو فیلبان ہوا کرتے تھے، ان کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ گویا یہ ایک تاریخی افسانہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں جون پور سلطنت کا ذکر بڑے فنکارانہ طور پر ہوا ہے، جس کی تصویر کچھ اس طرح ہے:

''اس وقت قلعہ فیروز شاہی میں ہاتھی گھوڑوں کی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ کوچ کا نقارہ بجنے پر فوجیں کوچ کیا کرتی تھیں۔ دمادم، دمادم۔ شفاف سڑک صبح خاک روب جھاڑو لگاتے اور شام کو بہشتی مشکوں سے چھڑکاؤ کرتے۔ سوندھی سوندھی خوشبو اڑتی تو عالموں کی ٹولیاں نکلتیں، خراماں، خراماں، ڈھال گر

ٹولہ میں لوہار ڈھالیں بنانے میں مصروف ہوتے اور درسگاہوں میں طالب علم اپنے اپنے ذہن کو جلا بخشتے۔ درس گاہوں نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ایک صدی بعد شیر شاہ جیسا مدبر، ذہین اور رعایا پرور بادشاہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا۔'' (نقش ناتمام،ص14)

اردو افسانے میں ماں کی عظمت کو بار بار ایک مرکزی موضوع کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ماں ایک ایسا کردار ہے جو نہ صرف گھر بلکہ پورے معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے ماں کی محبت، قربانی، اور عظمت کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ اردو افسانے میں ماں کو محبت کے سمندر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں نے ماں کے کردار کی عظمت اور اہمیت بتائی ہے اور اس کردار کو اپنے افسانوں میں مرکزی موضوع بنایا ہے۔ ذکیہ مشہدی نے بھی اسی طرح ایک افسانہ 'ماں' لکھ کر اپنی مثال آپ قائم کی ہے۔ ان کا مشہور افسانہ ''ماں'' ہے۔ جو ان کے افسانوی مجموعہ 'پارسا بی بی کا بگھار' میں شامل ہے۔ یہ اپنے فکر و فن کے لحاظ سے بڑا اچھا افسانہ ہے، جو ماں کی عظمت اور اہمیت کا ترجمان ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ماں کی ذات دنیا میں بہت انمول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماں کے پیروں کے تلے جنت ہے۔ لیکن ذکیہ مشہدی نے تو اس سے بڑھ کر بھی ماں کے بارے میں بتایا ہے کہ ایک ماں اپنے بچوں کی خاطر کس طرح پریشان رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میرے بچے دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازے جائیں۔ اس افسانے میں منی ایک ماں ہے جس کے ایک آٹھ سالہ پولیو زدہ بیٹا ہے اور دو پانچ پانچ سال کی بیٹیاں ہیں۔ ایک ایسی بستی میں بچوں کو لے کر رہتی ہے جہاں رات گئے تک لومڑیاں اور سانپ وغیرہ آنکلتے ہیں۔ آس پاس کھیت اور سبزہ ہے۔ جب صبح ہوتی مچھیارے اپنا اپنا جال نکالتے اور منی بھی مچھلی پکڑنے کا سامان لے کے نکلتی۔ مچھلیاں پکڑ کر ٹوکرا اٹھائے محلے محلے بیچ کر واپس آتی۔ ساتھ ہی ساتھ ضرورت کا سودا بھی خرید لاتی۔ منی ذات کی ملاح نہیں تھی بلکہ گنگا کے کنارے جھونپڑی میں رہنے کی وجہ سے وہ گنگا میں بسی۔ وہ مچھلیوں کے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں بیاہ کر کے یہاں آئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ گنگا ماں کے آنچل میں رہنے کو ملے گا، اس کو شروع سے گنگا ماں سے عقیدت اور محبت تھی۔ اس نے پھر بڑی مشکل سے مرغیاں خریدی تھیں تاکہ بچوں کو انڈے کھلا سکے۔ درج ذیل اقتباس میں ماں کی ممتا جاگ رہی ہے:

''شوہر کی گرفتاری کے پہلے سے ہی اس کا پہلوٹھی کا بیٹا بیمار رہا کرتا تھا۔ باپ کے جانے کے بعد گھر پر جو مصیبت آئی، اس میں اس کی بیماری کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ تب منی انھیں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ ایک دن وہ اس کے دروازے پر آئے۔ کسی نے انھیں بتایا کہ اس گھر میں ایک بیمار بچہ ہے۔ بچے کو دیکھ کر وہ کچھ فکر مند ہو گئے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا بہت ضروری تھا، لیکن ڈاکٹر صرف بدھ کو ملیں گے۔ اس دن جمعہ ہی تھا۔ اس بچے کو دوا کے ساتھ غذا کی بھی سخت ضرورت تھی۔ خالی دوا سے کچھ نہ ہوگا، انھوں نے تاسف سے سوچا تھا۔ انتہائی کمزور ہوتے ہوئے بچے کو گود میں لیے آنسو بہاتی منی ان دنوں دو وقت پیٹ بھر کھانا تک مہیا نہیں کرا پاتی تھی۔ جڑواں بچیاں اس کے پیٹ میں تھیں۔ آٹھواں مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ وہ کوئی کام نہ کر پاتی۔ خود اسے بھرپور غذا کی ضرورت تھی لیکن وہ دونوں بچوں، خاص طور پر پہلوٹھی کے بیمار کے لیے پاگل بنی رہتی۔'' (ریختہ ویب سائٹ)

ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک حساس دل رکھتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کا پلاٹ معاشرے میں عورت کے مسائل اور دیگر سماجی امور سے تشکیل دیتی ہیں۔ ان کے کردار سچے اور حقیقی ہوتے ہیں۔ قاری ان کرداروں میں خود کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کرداروں میں بدّو، اس کی بیوی اور اس کے علاوہ منّی حقیقی کردار ہیں۔ قاری کو منی پر ترس آنے لگتا ہے۔ یہ ذکیہ مشہدی کے اسلوب کا کمال ہے۔ افسانوں کو پڑھ کر تادیر ذہن میں ان کے کردار گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا لکھنے کا انداز بڑا منفرد اور دلچسپ ہے۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت موثر بھی ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک گہری بصیرت پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک نئے زاویے سے دیکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے نسوانی کردار بڑے متحرک نظر آتے ہیں۔

□□□

Dr. Mohd Raza
3378, Bada Ghar Bagichi Achcheygi
Bara Hindu Rao
New Delhi-110006
8587807929
alrazajlpr@gmail.com

ڈاکٹر محمد شریف

خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں کشمیر کی تہذیب و معاشرت

جموں کشمیر میں جب ہم اردو افسانے کی تاریخ کے حوالے سے یہاں کی خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ یہاں اردو افسانے کی ترویج و اشاعت نیز نئی سمت وصورت عطا کرنے میں جہاں مرد افسانہ نگاروں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہیں اس ضمن میں جموں وکشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات بھی اہم رہی ہے۔ ماضی سے لے کر حال تک یہاں کے افسانوی افق کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ گرچہ یہاں کی خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد بے حد کم ہے لیکن یہی کم تعداد بھی اپنی حیثیت منواتی نظر آتی ہے یہاں کی خواتین افسانہ نگاروں نے عورت کے جذبات، احساسات اور جذبۂ ایثار کو ہمیشہ بڑی چابکدستی اور فن کاری سے پیش کیا ہے۔ ان کا مقصد محض اپنی نمائندگی نہیں بلکہ عصری تقاضوں کے تحت سماج کو سجانے، سنوارنے اور نابرابری کے خاتمے کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام وصورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی خاصیت جموں کشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے آج کے زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ یہاں کی مقامی تہذیب و معاشرت کو اپنی کہانیوں کے لیے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

اس مضمون میں جموں کشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں کی حیات و خدمات کے ساتھ ان کے افسانوں میں پائی جانے والی مقامی تہذیب و معاشرت پر نظر ڈالتے ہوئے جموں اور کشمیر کی تہذیب و معاشرے کے اثرات ان کے افسانوں میں کہاں تک در آئے ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن افسانہ نگاروں کو زیر بحث لایا گیا ہے ان میں واجدہ تبسم گورکو، زنفر کھوکھر، ڈاکٹر ترنم ریاض کے نام شامل ہیں۔

واجدہ تبسم گورکو:

جموں کشمیر کی پہلی خواتین افسانہ نگار واجدہ تبسم یکم نومبر 1952 کو رعناواری کشمیر میں پیدا ہوئیں۔ اصل نام واجدہ تبسم گورکو قلمی نام تبسم ہے۔ والد کا نام غلام احمد اور والدہ کا نام محترمہ حمیدہ بیگم ہے۔ شریک حیات جناب عبدالرشید گورکو ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم وشو بھارتی اسکول میں ہوئی اور سرینگر گورنمنٹ ڈگری کالج رعناواری سے بی۔اے پاس کیا۔ اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) پھر ایم۔اے کشمیری کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے علاوہ واجدہ تبسم نے ہندی ڈپلومہ اور اردو آنرس کی ڈگری جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے حاصل کی۔

واجدہ تبسم گورکو کی تعلیم وتربیت کے بعد دوردرشن کیندر سری نگر سے وابستہ ہوئیں۔ دوردرشن میں کافی عرصہ تک سکشن آفیسر کے عہدے پر خدمات انجام دیتی رہیں اور اسی عہدے سے سبکدوش ہوئیں۔ ان کا

صحافت سے بھی تعلق رہا ہے وہ سابقہ ایڈیٹر خواتین ایڈیشن اخبار آفتاب اور چٹان ۔ سابقہ آنریری ممبر مجلس نسواں اور ساز سرمدی دہرہ دون رہ چکی ہیں اور اس وقت ایڈیٹر ویکلی اخبار العتیق ہیں ۔ وہ سوشل ورکر ہیں اور اپنے ادارے العتیق این جی او سے وابستہ ہیں ۔ انھوں نے کشمیر کی حسین وادیوں کے لوگوں کے درد کو اپنے وجود میں تحلیل کر کے اسے فن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ۔ واجدہ تبسم گورکو لکھتی ہیں:

"ان دنوں مجھے ریڈیو سننے کا بے حد شوق تھا اور اسی جنون کے تحت میں ریڈیو سے نشر ہونے والے بچوں کے پروگرام میں شریک ہونے لگی ۔ اسی پروگرام نے میرے ذوق کو تحریک دی اور میں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ میں مباحثوں اور مذاکرات کی محفلوں میں سرگرم حصہ لینے لگی ۔ وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ میرا شوق بھی پروان چڑھتا رہا ۔ دسویں جماعت میں مجھے ایک بزرگ استاد کی رہنمائی حاصل ہوئی جو اردو کے معلم تھے جب بھی کوئی مضمون، افسانہ، نظم یا غزل تخلیق ہوتی تو ان سے مشورہ صلاح کی طالب ہوتی ۔ مشفق استاد میری تحریر کو بڑی توجہ سے سنتے اور میں ان کے گرانقدر مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحریروں کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کرتی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی میرے افسانے اور میری غزلیں ملک کے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہونے لگے ۔ روزنامہ چنار کی خاص اشعار میں میرا پہلا افسانہ" آہ کے اثر ہونے تک" شائع ہوا۔"

(جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، واجدہ تبسم، سن اشاعت 2004، ص ۔ 318)

جموں وکشمیر کے خواتین افسانہ نگاروں میں سب سے پہلے واجدہ تبسم گورکو نے اردو افسانے کی طرف توجہ مرکوز کروائی ۔ وہ جموں وکشمیر کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں ۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا ہے ۔ ان کا پہلا افسانہ" آہ کے اثر ہونے تک" اردو کے مشہور و معروف اخبار" چنار" میں 1972 عیسوی میں شائع ہوا ۔ اس طرح سے انھوں نے اردو افسانہ نگاری میں قدم رکھا ۔ ''ڈولتی نیا'' واجدہ تبسم کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا جو دسمبر 1983 شائع ہوا ۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دل آج بھی روتا ہے'' 2019 میں شائع ہو چکا ہے ۔

واجدہ تبسم گورکو کے افسانے، مضامین، کالم، سیریل، ٹیلی فلمیں، شارٹ فلمیں، ڈیکوڈرامہ، غزلیں، گیت اور نظمیں وغیرہ ملکی اور بین الاقوامی سطح کے رسالوں، جریدوں اور اخباروں میں شائع ہوتے ہیں ۔ جیسے بیسویں صدی، خاتونِ مشرق، آجکل، تلاشِ رشتہ، دوردرشن میگزین (دہلی)، جوابِ عرض (پاکستان) نیا دور، تریاق، سب رس، تحریک ادب، شیرازہ کلچرل اکاڈمی جموں وکشمیر، تعمیر، چنار، کشمیر عظمیٰ، آفتاب، چٹان، سرینگر ٹائمز وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

واجدہ تبسم گورکو کے اب تک کئی شعری مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں ۔ غزلوں اور نظموں کا سنگم، گلہائے تبسم وغیرہ ۔ انھوں نے دوردرشن اور ریڈیو کے علاوہ ریاست اور بیرون ریاست میں اسٹیٹ اور آل انڈیا سطح کے پروگراموں، مشاعروں، افسانوی محفلوں اور بحث و مباحث میں حصہ لیا ۔ واجدہ تبسم بیک وقت ایک کامیاب شاعرہ، افسانہ نگار، مضمون نگار، کالم نگار اور بہترین صحافی کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں ۔ واجدہ تبسم گورکو نے اپنے افسانوں میں کشمیری عورتوں کے مسائل کی مکمل عکاسی کی ہے ۔ عورت کے جذبات، خوشیاں، درد وغم، محبت اور نفرت، آرزوئیں، عداوتیں، حسرت، مظالم، جہیز، طلاق، سماجی حیثیت، عزت وقار، قربانیاں، ممتا، بغاوت، وفا اور جفا وغیرہ جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے ۔

واجدہ تبسم نے اپنے افسانوں میں سیاسی، سماجی، نفسیاتی، معاشی اور اقتصادی موضوعات کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے ۔ مقامی کرداروں کے ذریعے انھوں نے اپنے آس پاس سے موضوع چن کر نئے انداز سے پیش کیے ہیں ۔ وہ دور حاضر کے حالات وواقعات سے باخبر ہیں اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں ان ہی حالات سے جوجھ رہے انسانوں کی روزمرہ پریشانیاں اور ان پریشانیوں کا ازالہ کرنے کا پیغام دیا ہے ۔ افسانہ" سپنوں کا سوداگر" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

" حالات کب من کے موافق ہوں، حالات کب اور کیسے نمودار ہوں، واقعات کے کب شکار ہوں یہ کوئی نہیں جانتا ہے اور اُن بھیانک چیزوں کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ انسان مشاہدوں سے نہیں بلکہ تجربوں سے سیکھتا ہے تو بے جانہ ہوگا۔"

(واجدہ تبسم گورکو، افسانہ سپنوں کا سوداگر، سن اشاعت 2019، ص ۔ 113)

واجدہ تبسم تخلیقیت کے ہر رمز سے واقف ہیں ۔ مقامی لوگوں کی زندگیوں اور سماجی حقائق پر اُن کی گہری نظر ہے ۔ ان کی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں، معاشی بدحالی، نفسیاتی کشمکش اور اخلاقی گراوٹ جیسے موضوعات شامل ہیں ۔ افسانہ" دل آج بھی روتا ہے" میں مصنفہ نے امن و

آشتی ،مساوات اور پیار ومحبت کے ساتھ ساتھ خواتین کی اندرونی اور بیرونی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجیے

"اصل میں اگر دیکھا جائے تو جو زندہ ہوتا ہے مرتا وہی ہے کیونکہ جسم کے کسی حصے میں اگر ایسا درد ہوا اور وہ حصہ جسم سے الگ کر کے پھینک دیتے ہیں اور جس جسم سے وہ حصہ کٹ جاتا ہے۔تو درد اسی جسم کو ہوتا ہے نہ کہ اس حصے کو جو جسم سے الگ ہو گیا ہوتا ہے۔اس لیے مرنے والا تو مر جاتا ہے۔مگر درد، پریشانی، فکر اور تشویش صرف اور صرف زندہ رہنے والوں کو ہی ہوتا ہے۔"

(واجدہ تبسم گورکو،افسانہ،دل آج بھی روتا ہے،سن اشاعت،2019 ۔ص۔79)

واجدہ تبسم کی کہانیوں میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں، ظلم و جبر، زیادتی اور استحصال کی عکاسی ملتی ہے۔افسانہ" وقت کے گھاؤ" میں انھوں نے ایک یتیم بچی کی زندگی کے مسائل کو پیش کیا ہے۔

افسانہ" وقت کے گھاؤ" کشمیری تہذیب ومعاشرت ،تاریخ ،رہن سہن اور کشمیریت کے حوالے سے واجدہ تبسم کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔

اس میں انھوں نے کشمیری عورتوں کی دکھ بھری داستان بیان کی ہے جو مختلف مسائل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ساتھ ہی انھوں نے کشمیری تہذیب و معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو ابھارا ہے۔جیسے کشمیر کے مختلف باغات، جھیلوں، میوؤں، اور برفانی پہاڑی کے علاوہ دیگر کلچر کو نمایاں کیا ہے۔

واجدہ تبسم کے مذکورہ افسانے میں کشمیری ماحول نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔وہ کشمیری تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی کرنے میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔انھوں نے کشمیر کی خوبصورتی کے ساتھ یہاں کی ڈل جھیل، جہلم، زعفران، سیب، اخروٹ، بادام، شال، قالین، پیر ماشی وغیرہ کا ذکر کیا ہے جو یہاں کی تہذیب کا اہم حصہ ہیں۔

واجدہ تبسم گورکو کے دیگر افسانوں میں بھی مقامی تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ کشمیری عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔واجدہ تبسم عورت کی نفسیات سے خوب واقفیت رکھتی ہیں۔ان کے نسوانی کرداروں میں ایک عورت ماں، بیٹی، بہو، ساس یا پھر بیوی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ زندگی کی حقیقت کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔واجدہ تبسم خود لکھتی ہیں:

" میں نے سماج، سیاسی، مذہبی، تہذیبی، تمدنی تحریکی، تمثیلی، تجارتی، نسوانی یعنی کل ملا کر سب صنفوں پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی ہے۔"

(واجدہ تبسم گورکو، دل آج بھی روتا ہے۔سن اشاعت،2019، ص۔44)

واجدہ تبسم کی شخصیت اور ان کے افسانوں کے متعلق مختلف ادیبوں کے تاثرات پیش خدمت ہیں:

" واجدہ تبسم گورکو کا شمار ستر دہائی کے بعد کی نسل میں ہوتا ہے۔جس نے وادی کے پرآشوب دور سے گزرتے ہوئے اردو زبان و ادب کی آبیاری کی ہے۔ساتھ ہی اپنی علمیت، ذہانت اور ریاضیت وصلاحیت کا لوہا منوالیا۔اُن کی زیادہ تر کہانیوں اور افسانوں میں کہانی پن کا حُسن اور ہر تحریر اپنے منفرد انداز میں موجودہ دور کی پیچیدگیاں خصوصاً سیاسی، سماجی، نسوانی اور ادبی ممکنات کی بالیدگی سے ظاہر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔واجدہ تبسم گورکو صاحبہ نے اردو افسانوں اور کہانیوں میں جس قدر محنت، لگن اور درد دل سے سماجی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی نظروں سے دیکھ کر نہایت ہی خوش اسلوبی اور شائستگی کے انداز سے اس پر سے پردہ سرکانے کی کامیاب سعی کی ہے اس میں سماجی اور معاشرتی

زندگی کی حقیقت کی صاف طور پر عکاسی کی گئی نظر آتی ہے۔"

(واجدہ تبسم گورکو، دل آج بھی روتا ہے، سن اشاعت 2019، ص۔28)

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ واجدہ تبسم گورکو نے کشمیری تہذیب و معاشرت کے ساتھ یہاں کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور نسوانی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اُن کے بیشتر افسانے زندگی کے آئینے کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں سماجی، نسوانی، تہذیبی اور معاشرتی کشمکش کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔

زنفر کھوکھر:

زنفر کھوکھر 19 ستمبر 1957 کو جموں کے ضلع پونچھ کے گاؤں کاہنڈی گلوہتہ میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام محمد شفیع کھوکھر تھا اور والدہ کا نام بگوبی تھا۔ زنفر کھوکھر کے والد اپنے ماں باپ کی اکیلی اولاد تھے۔ محمد شفیع کی شادی سے پہلے ہی ان کے والدین وفات پا چکے تھے۔ ان کے والد محمد شفیع کھوکھر پڑھے لکھے شخص تھے۔ زمینداری کے ساتھ ساتھ دکانداری بھی کرتے تھے۔ مالی حالت کافی اچھی تھی اس لیے گھر میں ہر طرح کی خوشحالی تھی۔

زنفر کھوکھر کے چار بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر اپنی بڑی بہن مکبر جان کے ذریعے ہوئی۔ مکبر جان اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے سبھی چھوٹے بہن بھائیوں کی نگہہ داشت کے ساتھ ساتھ ان کی ابتدائی تعلیم کے حصول میں بھی اپنا حق ادا کیا۔ گھر پر تھوڑی بہت تعلیم سیکھنے کے بعد زنفر کھوکھر کو گورنمنٹ پرائمری اسکول کاہنڈی گلوہتہ میں داخل کرایا گیا۔ یہ اسکول ریاست کے وزیر اعلیٰ محمد بخشی کے دور حکومت کی دین تھا اور اس گاؤں کا پہلا اسکول تھا۔ اس وقت لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کا کم رواج تھا لیکن نیا اسکول کھلا تھا، اس لیے آس پاس کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ زنفر کھوکھر بھی ذوق وشوق سے اسکول جانے لگیں۔

پرائمری اسکول کاہنڈی میں زنفر کھوکھر نے پانچویں تک کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کو ہائی اسکول ہرنی میں چھٹی جماعت میں داخلہ کرایا گیا۔ ہائی اسکول ہرنی سے انھوں نے 1975 میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور اسی سال ان کی شادی محمد حنیف سے ضلع راجوری کے گاؤں ساج میں ہوئی۔ لیکن شادی کے بعد بھی زنفر کھوکھر نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔

گیارہویں اور بارہویں جماعت کی تعلیم کے بعد انھوں نے پونچھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری بھی پرائیوٹ طور پر حاصل کی۔ کیونکہ وہ بارہویں جماعت کے بعد ٹیچر بن گئی تھیں اس لیے انھوں 1985 میں انہیں محکمے کی طرف سے بی۔ ایڈ کی ڈگری ریگولر حاصل کرنے کے لیے جموں یونیورسٹی میں بھیجا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے 1990 میں جموں یونی ورسٹی سے ایم۔ اے اُردو پرائیوٹ کیا۔ زنفر کھوکھر نے فاضل دینیات کا امتحان بھی پاس کیا۔

زنفر کھوکھر نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مختلف رسائل و جرائد کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جیسے تریاق، انشاء، شگوفہ وغیرہ۔ آہستہ آہستہ ان کی دلچسپی ادب کی طرف بڑھی پھر انھوں نے خود لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی "نسخہ" ہے جو ہند سماچار میں 1991 میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ "پرواز ادب"، "بیسویں صدی" وغیرہ میں بھی ان کی کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔ زنفر کھوکھر کے اب تک تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "خوابوں کے اُس پار" 1999 میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "کانچ کی سلاخ" 2003 میں شائع ہوا۔ "عبرت" اُن کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو 2010 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ وہ انشائیے اور افسانچے بھی لکھتی ہیں۔

زنفر کھوکھر نے سماج کے ہر پہلو کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش سے واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کرتی ہیں۔ زنفر کھوکھر نے اپنے افسانوں میں نہ صرف عصر حاضر کے نشیب وفراز کو بیان کیا بلکہ انھوں نے مقامی تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ معاشرتی پھندوں کو توڑ کر انسانی روح کی آزادی کو اپنا ایمان بنا رکھا ہے۔ زنفر کھوکھر اس بات کی قائل نہیں ہیں کہ انسان رنج وغم کے حصار میں مقید ہو کر رہ جائے یا پھر کسی بھی مسئلے کو اپنی جان کا روگ بنا لے۔ وہ پل پل ٹوٹنے اور بکھرنے کے بجائے خوشحال رہنے اور پُرسکون فضا میں سانس لینے کو ترجیح دیتی ہیں۔ زنفر کھوکھر کے بارے میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

> "زنفر کھوکھر صوبہ جموں کی ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھیں کہانیوں کی بنت کا فن آتا ہے۔ زنفر کھوکھر کے افسانوں میں محسوسات اور احساسات کے کئی پرتو دکھائی دیتے ہیں جو اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے ہر پہلو پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور زندگی سے وابستہ گونا گوں مسائل پر غور و فکر کرتا ہوا ذہن ان کے پاس موجود ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کے ہاں اگر حسیت اور عصری آگہی کے اوصاف موجود ہوں تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جو فن وہ تخلیق کرے گا اُس فن میں ایک معاشرہ سانس لیتا نظر آئے گا اور یہ خوبیاں زنفر کے ہاں کافی حد تک موجود ہیں۔"

(زنفر کھوکھر، کانچ کی سلاخ، ایک تاثر، اشاعت 2003)

زنفر کھوکھر اپنے افسانوں کے ذریعے مقامی معاشرہ کی بے راہ روی پر ایک پابندی عائد کرتے ہوئے گمراہ اور بھولے بھٹکے معاشرے کو درست کرنے کی آرزومند ہیں۔ ملاحظہ کیجئے یہ اقتباس:

"شادی ہونے پر لڑکی کو برعکس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں وقت لگتا ہے۔ سرکش لڑکیاں تو مخالفت میں تن کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور یوں بہو اور ساس نندوں کے جھگڑوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ مگر سنجیدہ لڑکیاں اپنے آپ کو صابر و شاکر بنا کر حالات سے نپٹ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ انسان کی خوبصورتی اُس کا اخلاق اور کردار ہے۔ میں ظاہری خوبصورتی کی بالکل قائل نہیں ہوں۔ آپ باتیں بہت اچھی کرتی ہیں۔ آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے؟ کوالیفکیشن بتانے کی چیز نہیں ہوتی ہے۔ کسی کی بات چیت اور عمل سے اُس کی کوالیفکیشن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

(زنفر کھوکھر، کانچ کی سلاخ، اشاعت 2003، ص۔156)

افسانہ "مجبوری" میں انھوں نے مقامی شادی کے رسم و رواج اور وہاں کے مجبور لوگوں کی زندگی کے واقعات کو پیش کیا ہے جو اپنی عزت بچانے کے لیے مختلف لوگوں سے اُدھار لے کر اپنے بچوں کی شادی کرتے ہیں۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ زنفر کھوکھر نے اپنے ذاتی تجربے اور واقعاتی نقشے کو قاری کے سامنے رکھنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ اُن کی کہانیاں مقامی تہذیب و معاشرت کے مختلف رنگوں کی آئینہ دار ہیں۔ جموں کے سرحدی علاقوں میں فوج، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور دیگر حفاظتی اداروں کی طرف سے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے ساتھ برتاؤ، آگ زنی، املاک کی تباہی، قتل و غارت، فرضی جھڑپوں میں انسانی جانوں کا زیاں، اخوانی اور مجاہدوں کے بھیس میں نقلی دہشت گردوں اور غنڈہ عناصر کا غریب اور لاچار لوگوں کو تنگ کرنا، ایسا پس منظر ہے جس میں زنفر کھوکھر کے افسانوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ اب کیا ہو گا، کب تلک، دستک، دھماکہ، وہ کون تھا، دو حکمران وغیرہ انہیں موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ زنفر کھوکھر کے افسانے جموں کی سیاست، تاریخ اور سماجیات کا ایک خوبصورت منظر نامہ کہے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ترنم ریاض:

ترنم ریاض 9 اگست 1963ء کو سرینگر کشمیر کے ایک اہل علم گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اصل نام فریدہ ترنم تھا۔۔ ان کے دادا چودھری خدا بخش خان مہاراجہ کی حکومت میں وزیر زراعت رہے ہیں۔ والد کا نام چودھری محمد اختر اور والدہ کا نام ثریا بیگم ہے۔ ترنم ریاض کی دو بہنیں ہیں، اُن کا کوئی بھائی نہیں ہے۔

ترنم ریاض نے ابتدائی تعلیم گرلز ہائی اسکول کرن نگر سرینگر سے حاصل کی۔ اس کے بعد وُمن کالج مولانا آزاد روڈ سرینگر سے گریجویشن کر کے کشمیر یونیورسٹی سے اردو اور ایجوکیشن میں ایم۔اے، بی۔ ایڈ اور ایم۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی اور عربی کی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ اُن کی پوری زندگی درس و تدریس اور تصنیف میں گزری۔ اس کے علاوہ وہ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی وابستہ رہیں۔ ترنم ریاض کی شادی 1983 کو کشمیر کے ہی ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ پروفیسر ریاض پنجابی سے ہوئی۔ جو کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ ترنم ریاض کے بطن سے دو بیٹوں نے جنم لیا بڑے کا نام بدران پنجابی اور چھوٹے کا نام میران پنجابی ہے۔

ترنم ریاض کی ادبی زندگی کا آغاز 1973 میں ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ 1975 میں روزنامہ "آفتاب" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے رسالہ آفتاب کا خواتین ایڈیشن ایڈٹ کرنا شروع کیا۔ اس طرح ان

کی کہانیاں اور دیگر تخلیقات ریاستی، ملکی اور بیرونی ممالک کے اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہیں۔ اپنے بچپن اور ادبی زندگی کے بارے میں ترنم ریاض اپنی کتاب "یہ تنگ زمین" میں خود لکھتی ہیں:

"بچپن میں کہانیاں سنی تھیں۔ پڑھی بھی تھیں۔ مگر کہانی سے میرا باقاعدہ تعارف اُس وقت ہوا تھا جب میری آپا میٹرک میں پڑھتی تھیں اُن کی ایک دوست کی کتاب میں، میں نے منشی پریم چند کی دو کہانیاں پڑھی تھیں انہیں دنوں میں نے اپنی پہلی کہانی "مصور" لکھی تھی۔ اُس وقت میں ریڈیو کشمیر سری نگر میں بچوں کے پروگرام کی باقاعدہ آرٹسٹ تھی۔ لیکن یہ کہانی مجھ سے نوجوانوں کے پروگرام میں پڑھوائی گئی تھی۔ جس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کہانی کے ذریعے بہت سی باتیں کی جاسکتی ہیں، سمجھائی جاسکتی ہیں۔"

(ترنم ریاض، یہ تنگ زمین، ابتدا، 2020ء، ص۔ 9)

ترنم ریاض بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعرہ، نقاد، محقق اور مترجم تھیں۔ انھوں نے بڑی محنت، لگن اور دلجوئی سے ادبی دنیا میں بہت جلد اپنا الگ مقام بنالیا۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں دو تحقیقی وتنقیدی تصانیف "بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب" اور "چشم نقش قدم"، چار افسانوی مجموعے "یہ تنگ زمین"، "ابابیلیں لوٹ آئیں گی"، "یمبرزل" اور "میرا رخت سفر"، دو ناول "مورتی" اور "برف آشنا پرندے"، چار شعری مجموعے "پرانی کتابوں کی خوشبو"، "بھادوں کے چاند تلے"، "زیر سبزہ محو خواب" اور "چاند لڑکی" اور تین تراجم "سنو کہانی"، "ہاؤس بوٹ پر بلی" اور "گوسائیں باغ کا بھوت" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ترنم ریاض ملک کی کئی اہم ادبی انجمنوں سے وابستہ تھیں۔ وہ کئی انعامات حاصل کر چکی ہیں۔ جن میں ریاستی کلچرل اکادمی ایوارڈ، ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ، دہلی اردو اکادمی ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی اور سارک لٹریچر ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر ترنم ریاض قومی راجدھانی دہلی میں 20 مئی 2021 کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئیں۔

ڈاکٹر ترنم ریاض کے بیشتر افسانے کشمیر اور کشمیری تہذیب و معاشرت کی بھر پور ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار معاشرے کے وہ افراد ہیں جو ظلم و زیادتی، جبر و استحصال اور ناانصافیوں کے پاٹ تلے دب کر ایسے کچل دئے کہ اپنی پہچان بھول گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات میں عورت کو ایک خاص مقام بخشا ہے۔ ترنم ریاض کی کہانیوں میں کشمیری لوگوں کی عصری زندگی کی عکاسی اور کشمیر کے جدید تہذیب و معاشرت سے وابستہ مسائل کی نقاب کشی بھی ملتی ہے۔ اس حوالے سے نور شاہ لکھتے ہیں:

"انھوں نے کشمیر کے جغرافیائی حالات، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی ورثے کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر اور کشمیریت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔"

(جان محمد آزاد، جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، ترنم ریاض، سن اشاعت 2004، ص 159)

ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں کشمیری لوگوں کی زندگی اور اُن کے مسائل کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کا تعلق کشمیر سے ہے لیکن انھوں نے مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ کشمیر سے اتنی دور رہنے کے باوجود بھی ان کے دل میں کشمیر کے لیے محبت اور ہمدردی کا جذبہ موجزن رہا۔ افسانہ "کشتی" میں ڈاکٹر ترنم ریاض نے کشمیر کے خراب حالات کی وجہ سے لوگوں کو کس طرح کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور گولی بارود سے کشمیری لوگ کس طرح کی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو موضوع بنا کر کشمیر کی تہذیب و معاشرت کو اجاگر کیا ہے۔ اس افسانے میں ترنم ریاض نے کشمیری لباس اور کانگڑی کے علاوہ کشمیری پہناوے کا ذکر کیا ہے جس کی ایک الگ شناخت ہے اور کشمیری تہذیب کا اہم حصہ بھی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"اس نے گھٹنوں سے ذرا اوپر تک کی لمبائی کا ہلکے رنگوں کی چھینٹ والے کسی موٹے کپڑے کا پھرن پہن رکھا تھا۔ کرتے کی کاٹ کا نسبتاً چوڑا، چغہ نما پیرہن، اتنا کھلا کہ اگر ہاتھ آستینوں کے اندر سے کھینچ کر جسم سے لگا لیے جائیں یا سوکھی جھاڑیوں کی آگ سے بھرے مٹی کے پیالے کے گرد بید کی نرم ہری ٹہنیوں سے بُنی گئی کانگڑی اس کے اندر رکھ لی جائے جب بھی اس پیرہن کی تنگی کا احساس نہ ہو۔ پھرن کے ساتھ اس نے نیم تنگ پائچوں والی اسی چھینٹ کی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کے پیروں کی جلد بھی گلابی تھی مگر ایڑھیوں کے آس پاس کی سخت کھال میں چھوٹی بڑی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ ورنہ اس کی ماں کے سر پر پھیلے سوتی رومال کے نیچے لگی ٹوپی، کسابہ، کے اندر سے ماتھے پر جھانکنے والے تین جھومروں اور کان کی بڑی بڑی بالیوں والا چاندی کا زیور کب کا گھر کی ضروریات کی نذر ہو گیا تھا۔ جبکہ ایسے زیورات پانی پر رہائش پذیر خاندانوں کے مخصوص زیوارت میں شمار ہوتے ہیں۔"

(ترنم ریاض۔ یمبرزل۔ افسانہ کشتی۔ سن اشاعت 2004۔ ص۔11)

ڈاکٹر ترنم ریاض نے افسانہ "مجسمہ" میں کشمیر کے تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی ورثے کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ دراصل یہ افسانہ پرانے کشمیر اور دور جدید کی زوال پذیر تہذیب کا موازنہ بھی کرتا ہے۔ اس کہانی کا کردار کشمیر کی حکایات بیان کرتے ہیں۔ اس کہانی میں انھوں نے کشمیری جھیلوں خاص طور سے ڈل جھیل اور ولر جھیل کی منظر کشی بھی کی ہے۔ جہاں سیاحوں کے ساتھ ساتھ مقامی لوگ بھی کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں۔ ان کشتیوں میں مختلف قسم کی سبزیاں اگتی ہیں۔ کہانی کے کردار اس گزرے ماضی کی تلاش میں نظر آتے ہیں جو تاریخ کے اوراق میں سمٹ کر رہ گیا۔

اس افسانہ میں ترنم ریاض نے یہاں کی پرانی اور نئی تہذیب و نئی حکومت کے درمیان ایک لکیر کھینچی ہے۔ انھوں نے یہاں کشمیر کی نویں صدی کی تاریخ (سُویہ کا کارنامہ) کو اُجاگر کیا ہے جو راجہ اونتی ورمن کی حکومت میں ایک دانا درباری حکیم تھا جس سے سوپور کی تاریخ کا بھی علم ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"کیا صدیوں پہلے کی طرح آج کوئی حکیم سُویہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ کیا پھر سے کوئی معرکہ سر نہیں ہوسکتا۔ کتنا مشہور ہے کشمیر کی تاریخ میں سُویہ کا کارنامہ۔ صدیوں پہلے کا کارنامہ۔۔۔ نویں صدی کے ایک راجہ اونتی ورمن کے راج میں ایک دانا حکیم سُویہ ہوا کرتا تھا۔ جہلم جو اُن دنوں وتستا کہلاتا تھا۔ گرمی کے موسم میں میں اکثر و بیشتر طغیانی پر ہوتا کہ دھوپ کی تمازت سے پہاڑوں کی برف پگھل کر وادیوں کی طرف بہہ نکلتی تھی۔ اور کنارے پر بسے گاؤں، شہر، سیلاب کی زد میں آجاتے تھے۔ خطے کے شمالی علاقوں میں ایک حصہ ہر برس جب سیلاب کا شکار ہونے لگا تو سُویہ نے رعایا سے محبت کرنے والے راجہ اونتی ورمن کے خزانے سے اشرفیاں لے کر دربار میں چھینکی جنہیں پانے کی خواہش میں لوگوں نے دریا کی تہہ سے مٹی نکال کر دربار کو گہرا اور کناروں کو اونچا کر دیا۔ جس سے سیلاب کا خطرہ جاتا رہا۔ لوگ سُویہ کے اس کارنامے کی وجہ سے اُسے حکیم سُویہ پکارنے لگے کہ اُس کی حکمت سے وہ ایک بہت بڑی مصیبت سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے تھے۔ اس مقام کا نام سُویہ پور رکھا گیا جو رفتہ رفتہ سوپور ہو گیا۔"

(ترنم ریاض۔ یمبرزل۔ افسانہ مجسمہ۔ سن اشاعت 2004۔ ص۔91)

ترنم ریاض اپنے گردو پیش کے واقعات کا گہرا مشاہدہ کر کے کہانی کا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں دور جدید کے سماج کی آئینہ دار ہیں۔ مذکورہ افسانہ میں جہاں ایک طرف کشمیری عوام کی داستان بیان کی گئی ہے وہیں کشمیری تہذیب، رہن سہن اور تاریخ کے بہترین نمونے بھی ملتے ہیں۔ افسانہ "یمبر زل" میں یہاں کی نمکین چائے کا ذکر کرتے ہوئے اس کو کشمیری برتنوں میں تیار کرتے ہوئے یوں دکھایا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"انھوں نے چولہے پر چڑھی نمک والی چائے سے بھرے تانبے کے گول پیندے والے پتیلے میں ذرا سا جھانکا اور چائے کا رنگ جانچنے کے لیے تانبے کے لمبے دستے والا کفگیر، پتیلے میں ذرا سا جھانکا۔ اور چائے کا رنگ جانچنے کے لیے تانبے کے لمبے دستے والا کفگیر، پتیلے میں گھمانے کے بعد اس میں چائے بھر بھر کر واپس ڈالتی رہیں۔ جالی والے دستے کے اندر پڑی کنکریاں، اوپر نیچے ہونے سے چھن چھن بجنے لگیں۔ کفگیر پتیلی کے کناروں پر ٹکا کر تبسم بیگم ریفریجریٹر کی طرف دودھ لینے کو بڑھیں۔"

(ترنم ریاض۔ یمبرزل۔ ناشر نرالی دنیا سن اشاعت 2004۔ ص۔122)

ترنم ریاض اپنے افسانوں کے موضوعات آس پاس پھیلی ہوئی عوامی زندگی سے لیتی ہیں۔ کشمیری تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ انھوں نے کشمیر کے موسم سرما کو بھی کہانی میں یوں دکھایا ہے۔ اقتباس:

"اُس دن سورج کی کرنیں چمکیلے آسمان سے ہوتی ہوئی باغیچے میں گر رہی تھیں۔ ٹین کی ڈھلوان ساخت کی چھت سے برف پگھل پگھل کر بوندیں بن ٹپکتی رہی۔ ہوا کچھ تیز چلنے لگتی تو یہ بوندیں زمین پر گرنے سے پہلے جم جم جاتیں اور فقط کوئی مہین سا قطرہ گرتا، باقی پانی کی مخروطی نلیوں کی صورت رہ جاتیں۔"

(ترنم ریاض۔ یمبرزل۔ سن اشاعت 2004۔ ص۔117)

ترنم ریاض نے اپنی کہانیوں میں عورتوں کے مسائل کو نہایت باریکی سے پیش کیا ہے۔ افسانہ "حور" بھی کشمیری تہذیب و معاشرت کے تعلق سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں کشمیر کے مسلم گھرانے کی لڑکیوں کا حسن ستم ظریفی اور غربت کی وجہ سے مرجھاتا ہے۔ جس کی عمدہ مثال کہانی کا کردار "شریفہ" ہے۔ وہ بے حد خوبصورت، پاکباز اور شرم و حیا سے مالامال اور ماں باپ کی فرماں بردار ہے۔ کشمیر کے ہر گھرانے کی طرح "شریفہ" کے گھر میں بھی یہ روایت ہے کہ شادی سے پہلے لڑکیاں

ہمیشہ گھر کی چہار دیواری کے اندر رہتی ہیں۔جس کی وضاحت ڈاکٹر ترنم ریاض اپنی کہانی میں اس طرح کرتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"ان پردہ نشینوں کو صرف اتنی اجازت تھی کہ اگر کہیں قریب ہی میں آتش زنی کی واردات ہو جائے یا زلزلہ آ جائے تو صرف اس صورت میں سب مکینوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگ بھی ہمارے گھر کے پائین باغ میں، جس طرف پیڑ بہت کم تھے، جمع ہو جاتیں، ورنہ اور کوئی صورت نہ تھی ان کے گھر سے باہر آنے کی اس دن تک جب کوئی گھوڑی چڑھ کر دلہا بن کر نہ آئے اور اسے ڈولی میں بیٹھا کر اپنی پناہ میں نہ لے لے۔پھر کوئی پردہ نہ تھا اور اگر تھا بھی تو بس برائے نام۔"

(ترنم ریاض، یہ تنگ زمین، افسانہ، حور، 2020ء ص۔ 65)

مذکورہ افسانہ میں انھوں نے کشمیری تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو ابھارا ہے۔جیسے اخروٹ کی لکڑی سے بنا سنگھار دان جس پر بیل بوٹے کے نقش بنائے گئے ہیں۔لکڑی کی بنی کنگھی، کشمیری لوگ کا رہن سہن اور روزمرہ زندگی کے لیے استعمال میں لائی جانے والی چیزیں، گھاس کی چٹائی، پھرن اور کانگڑی وغیرہ کا ذکر بڑے پیمانے پر کیا ہے۔

ڈاکٹر ترنم ریاض کے دیگر افسانے بھی کشمیری تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔خاص طور سے اماں، پھول، برف گرنے والی ہے، ماں صاحب، گندے نالے کے کنارے، بالنا، کانچ کے پردے، یہ تنگ زمین، حضرات و خواتین، چار دن، بالکنی وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانے اور کردار کشمیری تہذیب و معاشرت کی روایت کو اُبھارنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ان کے یہاں کشمیری حالات، واقعات، ماحول اور معاشرے کے مسائل پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں جس کو انھوں نے حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ترنم ریاض کی ادبی زندگی اور اُن کے افسانوں کے متعلق مختلف ادیبوں کے آراء ملاحظہ فرمائیں:

"ترنم ریاض وادی کشمیر کا گل نورس ہے جس نے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا ہے جہاں زمین سخت ہے اور آسمان دُور ہے۔دنیائے ادب کی رونق کے لئے نئے فنکاروں کا آون جاون بنا رہے تو بہت خوب ہے۔ترنم ریاض ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کا اظہار اور بیانیہ اُن کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ترنم ریاض نے بڑی صفائی اور آراستگی سے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی عناصر کارسازی اور کارفرمائی کے پس منظر میں واقعات پیش کیے ہیں۔اور زین العابدین کے تاریخی واقعے کو بیان فرما کر ایک اہم فلسفیانہ نکتے کی جانب توجہ دلائی ہے کہ تاریخ کے دھارے پر روک لگانے یا اس میں پھیر بدل کرنے سے گلاب اور جوہڑ وجود میں آ جاتے ہیں۔!"

(ترنم ریاض، یمبرزل، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ابوالکلام قاسمی، انور قمر، سن اشاعت، 2004ء۔ ص۔ 179)

جموں کشمیر کے ان نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت سی افسانہ نگار موجود ہیں۔جن کی کہانیوں میں کسی نہ کسی صورت میں مقامی تہذیب و معاشرت نظر آتی ہے۔ان میں نعیمہ مہجور، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، ڈاکٹر نکہت نظر، ڈاکٹر ممتاز کوثر، شبنم ضیا، میت کور، رافعہ ولی، سیدہ نسرین نقاش، تبسم ضیا اور رافعہ رسول مغموم وغیرہ کے نام شامل ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں جموں کشمیر کی تہذیب و معاشرت کے مختلف مسائل کو پیش کیا ہے۔یہاں کے افسانوی ادب میں اور بھی کئی خواتین افسانہ نگاروں کے نام موجود ہیں جن کے قلم فعال ہیں اور جموں کشمیر کے اردو افسانوی ادب میں اضافہ کر رہی ہیں۔ان میں بینا یوسف، زبیدہ گلزار، شمیمہ صدیقی اور عذرا بنت گلزار اور شاہینہ یوسف کے نام قابل ذکر ہیں۔یہ نوجوان قلم کار وہ ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کروایا ہے، جس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جموں وکشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں کا مستقبل تابناک ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جموں کشمیر کی خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں عام طور پر جموں کشمیر کی سماجی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی زندگی کی مرقع کشی کی ہے۔ساتھ ہی ان خواتین افسانہ نگاروں نے موجودہ دور کے تمام موضوعات کو بھی اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔

□□□

Dr. Mohd Shareef
Assistant Professor(Contractual)
Department of Urdu, Government Degree College,
Kargil, Ladakh-194105
Mob::8899238784
Email: shareef.sharifi786gmail.com

اردو غزل میں تصوف کا رنگ

ڈاکٹر شیخ کنیز فاطمہ

انسان کی تخلیق روح، اور جسم سے ہوئی اور روح کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔تصوف کی بنیاد روحانیت پر قائم ہے، روح کی پاکیزگی اور صحت کے لیے قرآن وحدیث کی تعلیمات سے واقفیت ضروری ہے ان علوم سے مکمل واقفیت تصوف ہے، تصوف اس صراط مستقیم کے مانند ہے جس پر چل کر انسان دنیا سے بے نیاز ہو کر اللہ کی قربت کی تلاش میں لو لگا دیتا ہے جس سے اسے تسکین قلب میسر آجاتا ہے، تصوف انسان کو خود آگہی اور خدا شناسی کی منزل تک لے جاتا ہے انسان پر زندگی کے تمام اسرار و رموز اسی کے ذریعے واہوتے ہیں یہ ایک ایسی صداقت وحقیقت ہے جس سے کسی طرح بھی علیحدگی ممکن نہیں تصوف نیک خوئی اور نیک خلقی کو کہتے ہیں، تصوف تطہیر قلب، مصفا باطن اور تعمیر ظاہر و باطن ہے کہ اس میں تزکیہ نفوس، تصفیہ اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی ابدی سعادت کا حصول بھی، تصوف قلب کو ذکر الٰہی سے آراستہ کرنے کا نام ہے۔

بقول عمرو بن عثمان مکیؒ

”تصوف یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اسی کام میں مشغول ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس وقت کے لئے بہترین اور مناسب ترین ہو“ (اسلامی تصوف، ص27)

اردو شاعری ابتدا ہی سے صوفیانہ خیالات کی عکاسی اپنے مخصوص انداز میں کرتی رہی ہے، اردو کی بیشتر اصناف سخن جیسے غزل، نظم، مثنوی، رباعی وغیرہ کو وعظ ونصیحت، تبلیغ اسلام، تزکیہ روحانی اور رشد و ہدایت کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے چونکہ مقصد پند ونصیحت اور تبلیغ تھا تو اس کے لیے مقامی وعوامی زبان کو اپنایا گیا تا کہ زیادہ سے زیادہ افراد تک ارشادات واقوال پہنچے اردو کی ابتدائی ترویج میں صوفیائے اکرام کا اہم کردار رہا ہے انھوں نے مقامی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا تو یہیں سے زبان اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اردو کے روپ میں جلوہ گر ہوئی اردو شاعری کی مشہور ومقبول اصناف جیسے غزل، مرثیہ، نظم، مثنوی اور قصیدہ میں تصوف کے رنگ نظر آتے ہیں۔

غزل کے ارتقائی دور میں اس کا عہد زریں وہی ہے جب اس نے تصوف کے موضوع کو اپنایا، صوفی شعراء نے اپنی واردات قلب کا اظہار غزل میں کیا ساتھ ہی فلسفہ تصوف کی اصطلاحوں میں شاعروں نے حیات و کائنات کے مختلف مسائل کے بارے میں اپنے خیالات ونظریات رقم کیے، غزل اپنی رمزیت، ایمائیت کی وجہ سے تمام اصناف سخن میں انفرادی مقام رکھتی ہے، اس صنف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متنوع موضوعات کی ترجمانی، واردات قلب کی صورت میں ہوئی اردو غزل گو شعراء جنھوں نے اردو غزل میں تصوف کے موضوع کو اپنایا ان میں ایک اہم نام امیر خسرو کا ہے، جنھیں فارسی کے علاوہ اردو میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے بیان کی ایسی نہریں بہائیں جس سے آج بھی بیشتر افراد سیراب

ہورہے ہیں، آپ کو''طوطیء ہند'' کے لقب سے نوازا گیا آپ بیک وقت عالم، باعمل صوفی، باکمال شاعر، مفکر و فلسفی اور ادیب کامل تھے بحیثیت صوفی شاعر آپ نے تصوف کے مسائل کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا آپ کی شاعری عشق حقیقی کی آئینہ دار ہے اور کلام تصوف سے لبریز ہے واردات قلبی، عرفان الٰہی، تنزلیہ نفوس وغیرہ کی عکاسی بڑے پر لطف انداز میں بیان کی ہے انھوں نے اپنی تعلیمات سے آدمیت کو انسانیت کا درس دیا ان کے افکار و خیالات اور ذاتی مشاہدات ان کی تخلیقات میں جھلکتے ہیں۔

جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا
جیا حقا الٰہی کیا کیا آنسو چلے بھر لانے کر

قلی قطب شاہ کو پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے ان کی غزلوں میں انداز بیان کی سادگی، سلاست روانی اور برجستگی نظر آتی ہے قطب شاہی سلطنت جو کہ علم و ادب اور تہذیب و تمدن سے مرصع تھی لہذا اس تہذیب و تمدن کی عکاسی و ترجمانی بھی قلی قطب شاہ کے ہاں نظر آتی ہے ان کی شاعری کا اصل موضوع حسن و عشق ہے لیکن اس کے علاوہ ان کے کلام میں تصوف کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ملاحظہ فرمائیں

میں نہ جانوں کعبہ، و بت خانہ، و میخانہ کوں
دیکھتا ہوں ہر کہاں دستا ہے تجھ مکھ کا صفا

غواصی یوں تو بحیثیت مثنوی نگار شہرت رکھتے ہیں لیکن ان کی کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی و رباعی جیسی اصناف بھی شامل ہیں ان کی غزلوں میں اخلاقی اور روحانی عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہیں ہے۔ ان کی زبان و بیان میں سادگی، روانی، اور موسیقیت پائی جاتی ہے ان کے جو اشعار متصوفانہ رنگ کے حامل ہیں وہ بے مثال شدت تاثیر رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

منج غواصی کوں توں باطن میں نہ دیکھ اس سے جدا
شاہ رگ ہمنے ہے نزدیک اگرچہ ہے بعید
گر زندگی کی منج توں خبر پوچھتا ہے توں
جس زندگی کو مرگ نہیں وہ زندگی بھلی

اٹھارویں صدی کے وہ شعراء جن کی شاعری میں تصوف کا رجحان دکھائی دیتا ہے ان میں ولی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے اپنے پیش رو شعراء سے حاصل کردہ روایات میں اپنے علم و فضل سے کسب فیض اٹھا کر ان تمام عناصر کو اپنی شاعری میں شامل کر دیا ہے جس سے ان کی شاعری منفرد رنگ و آہنگ اختیار کر گئی ان کی غزلوں میں تصوف کے مختلف رموز و نکات جدید رنگ و آہنگ میں سادگی و دلکشی کے ساتھ پائے جاتے ہیں:

ولی کوں نہیں مال و زر کی آرزو
خدا دوست نہیں دیکھتے زر طرف

سراج اورنگ آبادی کے مشہور و معروف صوفی شاعر ہیں بحیثیت غزل گو شاعر اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں آپ کی غزلوں کا متصوفانہ رنگ بڑا ہی پرتاثیر ہے آپ کے اشعار تصوف کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں جن میں واردات قلبی اور مشاہدات ذاتی کی جلوہ گری نظر آتی ہے وحدت الوجود کے علاوہ معرفت کی مختلف راہوں سے گزرتے وقت آپ جن کیفیات سے دوچار ہوئے ان کی حقیقی ترجمانی بڑے فنکارانہ انداز میں اور سادگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

سب جگت ڈھونڈ پھرا یار نہ پایا لیکن
دل کے گوشہ میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
خاک تیرے قدم پاک کی اے نور نگاہ
سرمہء دیدہء جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

متصوفانہ مضامین کو خواجہ میر درد نے بڑی خوبی سے شاعری میں پیش کیا ہے وہ اٹھارویں صدی کے ممتاز صوفی شاعر ہیں ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ غالب تھا انھوں نے اپنے اشعار میں صوفیانہ تصورات و اصطلاحات کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے اور ان تصورات میں جذبات کی آمیزش سے یہ درد کے ذاتی تجربہ کا حصہ بن گئے ہیں، واردات قلبی ان کے کلام کو پراثر بنا دیتی ہے۔

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

درد کے اشعار تصوف کے پاکیزہ جذبات سے لبریز و سرشار ہیں ایسی شاعری میں مسائل تصوف کی آبیاری میں داخلی جذبات و کیفیات عشق حقیقی کا سوز درد و کسک کی ترجمانی ملتی ہے:

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ جہاں کہ تو سما سکے

میر اثر نے بھی اپنی شاعری میں مسائل تصوف کی آبیاری کی ہے اور تصوف کے بیشتر مسائل کو اپنی غزلوں میں جگہ دی ان کی شاعری صوفیانہ شاعری کے گوہر آبدار ہے ان کی غزلوں میں عشق حقیقی کا سوز و گداز عرفان الٰہی ذاتی مشاہدہ کا عکس بڑی خوبی کے ساتھ جھلکتا ہے:

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں
پر ہمیں آہ کچھ نظر ہی نہیں

مرزا محمد رفیع سودا نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی

ہے جیسے غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی مرثیہ، واسوخت ہجو وغیرہ ہر ایک میں ان کا امتیازی ومنفرد رنگ نمایاں ہے۔ وہ صوفی شاعر تو نہیں تھے لیکن چونکہ ان کے عہد میں شاعری کا مقبول موضوع تصوف تھا تو انھوں نے بھی تصوف کے حقائق ومعارف کو اپنی شاعری میں پیش کیا جس سے ان کے فضل وکمال پر روشنی پڑتی ہے

رکھ سر کو اپنے شمع کی مانند زیرِ تیغ
عاشق ترا وہی ہے جو ثابت قدم رہے

اردو غزل میں تصوف کی آبیاری کے سلسلے میں قائم چاند پوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو کہ شاعری کا فطری ذوق رکھتے ہیں ان کی غزلوں کے اشعار میں سادگی وسلاست اور دلکشی کے ساتھ صوفیانہ مذاق اور عارفانہ بصیرت ہے جس سے دلوں میں سوز وگداز پیدا ہوتا ہے وہ عام فہم انداز میں رفعت خیال کو پیش کرتے ہیں ان کی غزلیں منفرد رنگ وآہنگ لیے ہوئے ہیں:

اٹھ جائے گر یہ بیچ کا پردہ حجاب سے
دریا ہی پھر تو نام ہے ہر ایک حباب کا

میر تقی میر اردو شاعری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ کا شاعرانہ انداز مہارت، قدرت بیان اور فصاحت دلوں کو تسخیر کرتی ہے۔ آپ کی شاعری کا اصل محور عشق ہے جو عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر کرتا ہے دونوں ہی طرح کے بیان میں سوز وگداز، دردمندی کا احساس ہوتا ہے آپ کی غزلوں میں خود آگہی قناعت اور استغراق کے اوصاف موجود ہیں جس سے کلام پر تاثیر ہوگیا ہے آپ نے اپنی غزلوں میں تصوف کو بڑے سلیقہ سے برتا ہے:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

صوفیانہ غزلوں کے ارتقا میں نظیر اکبرآبادی بھی قابلِ ذکر ہیں ان کے متصوفانہ رنگ کے حامل اشعار کی بلند تخیلی، زورِ بیان اور طرزِ ادا کی ندرت ان کے شاعرانہ فضل وکمال کی خوبی ہے اردو غزل میں تصوف کی روایت کو آگے بڑھانے میں مصحفی کا نام بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے آپ ایک بسیار نویس شاعر ہیں۔

ان کے علاوہ اردو زبان وادب میں اصلاح زبان کے سلسلے میں امام بخش ناسخ ایک اہم ترین نام ہے۔ معیاری اسلوب کے حامل ناسخ نے اپنی غزلوں میں تصوف کے رموز ونکات، حقائق وقت معارف کی دل آویز عقدہ کشائی کی ہے ان کی فنی بصیرت کا ثبوت لائقِ تحسین ہے:

گر قناعت ہو تو نان خشک ہے نعمت والا
دیکھ لے پانی، چراغ گل کو روغن ہوگیا

اردو شاعری میں مضمون آفرینی ونازک خیالی کے لیے حکیم مومن خان مومن بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی غزلوں میں حسن وعشق کی مختلف کیفیات نظر آتی ہیں:

دھو دیا اشک ندامت نے گناہوں کو مرے
تر ہوا دامن تو ہارے پاک دامن ہوگیا

آتش قلندرانہ مزاج کے حامل تھے۔ ان کی شاعری زبان کا حسن اور جذبات کی صداقت کا امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تصوف کے مسائل کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی ہے آپ کے متصوفانہ اشعار پر تاثیر اور سوز وگداز کی کیفیات سے پر ہیں۔

قصیدہ میں اپنی عالمانہ شان اور فنکارانہ پختگی کے لیے مشہور شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوق اردو شاعری میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں آپ کی متصوفانہ شاعری میں متانت، ترنم، سادگی، سوز وگداز پایا جاتا ہے ذوق کی شاعری عارفانہ وعاشقانہ لب ولہجہ کا امتزاج ہے

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ واژدھا وشیر نر مارا تو کیا مارا

حالی نے اپنی شاعری سے اصلاح معاشرہ اور پیغمبری کا کام لیا آپ کے کلام میں شدت تاثیر، مصفا زبان وبیان دردمندی جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں آپ کا متصوفانہ کلام سوز وگداز سے لبریز ہے آپ نے تصوف کے مضامین بڑی خوبی سے باندھے ہیں:

جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعت سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

امیر مینائی درویش صفت اعلی اخلاق وعادات کے حامل تھے تصوف ان کی شاعری کا نمایاں موضوع تھا، برجستگی، سادگی، فصاحت وبلاغت آپ کی غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں

حق شناسی کی حقیقت کو انہی نے جانا
اے میر اپنی حقیقت کو جو پہچان گئے

غالب اردو زبان ومحاورے پر زبردست گرفت رکھنے والا اردو شاعری کا ایک اہم نام مرزا اسداللہ خان غالب کا ہے وہ مکمل صوفی تو نہیں تھے تاہم ان کے مزاج میں متصوفانہ خیالات تھے جنھیں انھوں نے شعری قلب میں ڈھالا حیات وکائنات کے مختلف مسائل کی عکاسی انھوں نے اپنی غزلوں میں کی اور بڑے فنکارانہ انداز میں متصوفانہ افکار کو اپنی غزلوں

میں پیش کیا:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

اردو شاعری میں اکبرالہ آبادی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی وہ قوم کی اصلاح چاہتے تھے لیکن یہاں انھوں نے قوم کی حالت پر آنسو بہانے کے بجائے قہقہے لگائے اور پھر طنز کے نشتر گھونپ کر انھیں جگانے کی کوشش کی آپ نے اپنی شاعری میں اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کو ظرافت کے پیرایہ میں بیان کیا آپ کی شاعری جذباتی یا تخیلاتی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے ان کے عارفانہ اشعار کا رنگ وآہنگ اور سوز و تپش ملاحظہ کیجئے:

بہت دشوار ہے شائستہ راہ طلب کرنا
نظر کا حد میں رہنا شوق کس با ادب ہونا

دنیائے غزل میں ایک اہم نام شاد عظیم آبادی کا بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں تصوف کی آبیاری میں سوز و گداز، کرب و کسک شامل ہے تصوف کے مسائل ان کے اشعار میں بڑی خوبی سے باندھے ہوئے نظر آتے ہیں، جو قاری کے دل کو مسحور کر دیتے ہیں:

دل کی وسعت کو بڑھایا تیرے دھیان نے
تھا تو قطرہ اس قدر پھیلا کہ دریا ہوگیا

محمد شوکت علی خان فانی صوفی شاعر نہیں البتہ انھوں نے اپنی غزلوں میں زندگی و کائنات کے اسرار و رموز کو پیش کیا ہے عشق حقیقی کی ہلکی پھلکی چبھن انھیں لذت بخشتی ہے مثلاً:

خلق کہتی ہے جسے دل تیرے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

حسرت موہانی کی شاعرانہ انفرادیت ان کی زبان و بیان کی خوبی ہے، انھوں نے محض حسن و عشق کی واردات و کیفیات ہی کو اپنی غزلوں میں بیان نہیں کیا بلکہ ان کی غزلوں کے موضوعات میں تصوف کے رنگ بھی موجود ہیں انھوں نے اپنی غزلوں میں بڑے ہی پر تاثیر انداز میں تصوف کے مضامین باندھے ہیں:

ترے درد سے جس کو نسبت نہیں ہے
وہ راحت مصیبت ہے راحت نہیں ہے

اصغر گونڈوی نے اپنی شاعری میں تصوف کو انفرادی پیراہن میں پیش کیا ہے آپ کی شاعری میں نشاط و سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے جیسے:

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پر مصور بھی تنہا نظر آتا ہے

اسرار عشق ہے دل معطر لیے ہوئے قطرہ ہے بے قرار سمندر لیے ہوئے

جگر مراد آبادی بزم تصوف کے ایک روشن چراغ ہیں جنھیں دنیائے شاعری ''رئیس المتغزلین'' کے نام سے جانتی ہے اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے تصوف کو بھی اپنی غزلوں کا موضوع بنایا جو واردات قلبی کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے جس میں روانی و شگفتگی، زبان کی نرمی و لطافت اور جدت دکھائی دیتی ہے:

نظر ملتے ہی دل کو وقف تسلیم و رضا کردے
جہاں سے ابتدا کی ہے وہیں پر انتہا کردے

علامہ اقبال ایک فلسفی ایک شاعر اور ایسے شاعر جنھوں نے اپنی شاعری کو پیغمبری کا آلہ کار بنایا آپ نے صحت مند رجحانات سے اردو شاعری کو آشنا کیا علم کی تحقیر اور عشق کی تفصیل جس طرح صوفیائے کرام کا خاص نظریہ رہا اقبال کے کلام میں بھی یہ پایا جاتا ہے۔ آپ ایک درویش مسلک گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو تعلیم و تربیت اور شعور انھیں اپنے گھر و اساتذہ سے میسر آیا اس سے ان کی فہم و فراست کو پختگی و بالیدگی عطا ہوئی ان میں شاعری کی خداداد صلاحیت موجود تھی علامہ اقبال کا مطالعہ وسیع تھا۔ آپ نے مشرق و مغرب کے مختلف علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے فکر و فلسفہ سے ملک و قوم کی اصلاح کا کام لیا آپ کی شاعری مختلف اقسام کے تجربات و افکار کا خزینہ ہے ذیل کے اشعار سے آپ کے صوفیانہ مزاج کی عکاسی ہوتی ہے ملاحظہ فرمائیں:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

❐❐❐

Dr.Shaikh Kaneez Fatima
Assistant Prof.
Dr. Rafiq Zakaria for Women
Navkhanda, Jubilee Park,
Aurangabad-431001 (M.S)
Mob: 7769969646
dr.kaneezfatma76@gmail.com

مہر فاطمہ

احمد جمال پاشا

بحیثیت طنز و مزاح نگار

احمد جمال پاشا کے تعلق سے یہ جملہ کئی بار دہرایا جاتا رہا ہے کہ وہ اور مزاح دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔ احمد جمال پاشا کی تحریروں کی انفرادیت یا ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے گردو پیش کی زندگی سے ہی موضوع اٹھاتے ہیں۔ ان کی تخلیق میں منظر نگاری، بات میں بات پیدا کرنے کی مہارت اور شگفتہ بیانی خود بخود ظرافت کی لہریں پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ اپنی تحریروں کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''اگر کسی مضمون کے مطالعے کے دوران آپ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جائے تو اسے مزاحیہ فرض کر لیجیے گا۔ اگر سر سے گزر جائے تو اس کا شمار طنز میں کیجیے گا۔ ورنہ سمجھ جائیے کہ یہ محض انشائیہ ہے۔'' (پیش لفظ، لذت آزار، ص5)

احمد جمال پاشا اسکولی سرٹفکیٹ کے مطابق یکم جون 1936 اور مصدقہ خانگی تاریخ کے مطابق 1929 میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام آغا محمد نزہت پاشا تھا۔ ان کی عرفیت یا پیار کا نام جمال تھا۔ ادبی دنیا انھیں احمد جمال پاشا سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ ان کے والد آغا شجاعت حسین پاشا الہ آباد میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ اردو فارسی کے شاعر و ادیب اور صوفی بزرگ تھے۔ ان کے مریدوں کا بہت بڑا حلقہ پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ احمد جمال پاشا کے والد آغا شجاعت حسین 1940 میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر الہ آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے۔ امین آباد میں انھوں نے ایک مکان کو خرید لیا جس میں کبھی مجاز رہ چکے تھے۔ آغا صاحب نے مکان کی تجدید کرائی اور اس کا نام اہلیہ کے نام پر ''سروری منزل'' رکھا۔ اسی 'سروری منزل' میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ ان کے خاندانی حالات بہت کم دستیاب ہیں۔ آباؤ اجداد اور شجرہ نسب کا ذکر انھوں نے چند جملوں میں اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب صوفی شاعر ناصر علی سرہندی سے جا ملتا ہے جو ولی دکنی کے معاصرین میں سے تھے۔

1950 میں احمد جمال پاشا نے میٹرک، 1953 میں انٹر میڈیٹ، 1956 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور 1958 میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1950 میں اپنی مزاحیہ مضمون ''من چغد بیایانم'' سے کیا جو کہ جالندھر سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''راہی'' میں شائع ہوا تھا۔

علی گڑھ میں انھیں قاضی عبدالستار، قمر رئیس، محمود الٰہی، تنویر احمد علوی، اقبال مجید، راہی معصوم رضا، شہریار، سید امین اشرف، شہاب جعفری

اورسید شاہد مہدی جیسے ساتھیوں کی صحبت ملی۔جس نے ان کے ذہن اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ان کے اساتذہ میں معین احسن جذبی، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، پروفیسر محمد حسن اور مجاز کے بہنوئی ڈاکٹر ابوسالم جیسے اکابرین علم وادب تھے۔جن کی تربیت سے ان کے ذہن وشعور کو روشنی ملی۔ وہ جامعہ اردو جریدے "درس" کے نائب مدیر ہوئے جو بعد میں ماہنامہ ادیب ہوگیا۔سرسید ہال میگزین اسکالر کے ایڈیٹر بھی رہے۔انھوں نے رشید احمد صدیقی کے طرز نگارش پر ''طرزِ نگارش میری'' کے عنوان سے جو نثری پیروڈی ایک کانفرنس میں پڑھی اس پر رشید احمد صدیقی نے خوش ہوکر انھیں اپنی کتابیں انعام میں دی تھیں۔

1959 میں انھوں نے لکھنؤ سے ماہنامہ ''اودھ پنچ'' شائع کرنا شروع کیا۔اودھ پنچ کے صرف تیرہ شمارے نکلے جن میں ''کنہیا لال کپور نمبر'' مزاحیہ ادب وصحافت میں یادگار کارنامہ اور احمد جمال پاشا کی صحافتی لیاقت کا ثبوت ہے۔1961 میں حیات اللہ انصاری نے انھیں قومی آواز کے ادارے میں شامل کرلیا جہاں 1976 تک وہ قومی آواز سے وابستہ رہے۔اس کے بعد وہ سیوان منتقل ہوگئے اور وہاں ذکیہ آفاق کالج میں اردو کے لیکچرر ہوگئے۔28 ستمبر 1987 کو پٹنہ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔سیوان میں شہر میں تدفین ہوئی۔

ان کی کتابوں کو مغربی بنگال، بہار، اتر پردیش کی اکادمیوں نے انعامات سے نوازا۔ہندی کی ایک ادبی تنظیم نے 1986 میں یوگ مایا ساہتیہ پرسکار، ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کی طرف سے الہ آباد کانفرنس میں" نشان سجاد ظہیر، اور 1986 میں غالب اکیڈمی دہلی نے ساگر سوری غالب انعام سے بعد از مرگ نوازا۔

ان کی کتابوں میں ''عزت آزار، مضامین پاشا، اندیشہ شہر، آئینے، فن لطیفہ گوئی چشم حیراں، ستم ایجاد، لذت آزار، شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت، ظرافت اور تنقید اور پتیوں پر چھڑکاؤ، غالب سے معذرت کے ساتھ، طلسمی کتا، اور ہجویات میر'' وغیرہ اردو کے اس صاحبِ طرز مزاح نگار کو ہمیشہ یاد رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

پاشا صاحب کے انشائیہ نما مضامین یا فکاہیوں کے مجموعے ''اندیشہ شہر میں'' میں ان کی بہترین مزاحیہ تخلیقات شامل ہیں۔مثلاً مقدمہ کا مقدمہ، ادب میں مارشل لاء، مرزا ظاہر دار بیگ، آموختہ بیانی میری، میری بہن کی سہلیاں، غدر 1857 کے اسباب، رسم امتحان میں، یونیورسٹی کے لڑکے، کتے کا خط پطرس کے نام، اور گدھے کا خط کرشن چندر کے نام وغیرہ سدابہار تحریریں ہیں۔احمد جمال پاشا کا مطالعہ کئی حوالوں یا حیثیتوں سے کیا جاسکتا ہے۔مثلاً بحیثیت انشائیہ نگار، تحریف نگار، خاکہ نگار، تنقید نگار، محقق، صحافی اور بچوں کے ادیب وغیرہ نامور دانشور ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''ان کے یہاں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے۔ جہاں کہیں طنز ہے ان کی ہمدردانہ نظر، ان کی شگفتگی اور ظرافت میں لپٹی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کا سارا ردعمل ایک ایسے شخص کا ردعمل ہے جو مسرت اور شادمانی مٹھی بھر بھر کے لٹاتا ہے۔اور جسے زندگی کی تمام ناہمواریاں بے حد عزیز ہیں۔ اس لیے ان کا اصل منصب ایک مزاح نگار کا ہے۔''

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''پاشا صاحب اس لحاظ سے مزاح نگار ہیں کہ ان کے یہاں ہمدردانہ اندازِ نظر موجود ہے۔اور وہ نفرت نہیں جو طنز نگار کے یہاں بہت نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ طنز کے استعمال سے شرمانا بھی نہیں جانتے۔بس یہ سمجھئے کہ وہ مخاطب کی چٹکی لیتے ہیں اور جب وہ ''سی'' کرکے ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو بڑے پیار سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگتے ہیں۔اور وہ بھی خفیف ہوکر ان کی ہنسی میں شریک ہو جاتے ہیں۔'' (مقدمہ اندیشہ شہر، ص8)

احمد جمال پاشا کا مشاہدہ جتنا قوی اور تیز تھا، اس سے کہیں زیادہ قوی اور تیز ان کی وہ صلاحیتیں تھیں، جو کسی بھی مشاہدے کو بآسانی طنز و مزاح میں بدل دیتی تھیں۔ ان کی ظریفانہ انشاپردازی کے نمونے کے طور پر ہم نے ریسرچ کی، کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''انھوں نے نہایت اطمینان سے ہمارا مرثیہ سنا، اس کے بعد پوچھا: تمہارے تھیسس کا عنوان کیا ہے؟ عرض کیا: ڈاکٹر صاحب عنوان نے ''اردو شاعری میں تال وسر کی اہمیت'' وہ کچھ سوچتے ہوئے اندر گئے اور تھوڑی دیر میں ہم پر ہنستے ہوئے واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک نہایت بوسیدہ جلد تھی۔ جو رسالہ ''گیت کار'' کی سال بھر کی فائل تھی اور بولے یہ دیکھو، 1857 میں غدر کے زمانے میں نکلتا تھا۔ اس کی دوسری جلد کہیں نہ ملے گی۔ قطعی نایاب ہے۔ اس میں استاد اللہ رکھا کا ایک مسلسل مقالہ ''تال وسر کی شعریت کی اہمیت'' چھپا تھا۔ تم اسے ابواب میں تقسیم کر کے اپنا Synopsis کے مطابق نقل کرتے جاؤ۔ اور جہاں لفظ ''شعریت'' آئے وہاں شاعری لکھ دینا۔ بس پھر تم کو دنیا میں ڈاکٹر ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہم نے رسالے کی جلد اپنے پورٹ فولیو میں رکھی۔ اور گھر پہنچ کر کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ ایک مہینہ تک ہم انڈرگراؤنڈ رہے۔ مہینہ بھر بعد ہم تھیسس لے کر برآمد ہوئے تو ڈاکٹر بندے علی نے نہایت ایمانداری کے ساتھ رسالہ ''گیت کار'' کی جلد کو ماچس دکھا دی۔ ہم نے تھیسس ٹائپ کروا کر داخل کی اور یونیورسٹی نے ہمیں ڈاکٹریٹ عطا کر کے نہ صرف گاؤن میں تصویر کھینچوانے کا موقع عطا کیا بلکہ ہمارے بندے علی کی کوشش اور ہیڈ آف ڈی پارٹمنٹ صاحب کی مہربانی سے کچھ ہی دن میں ڈاکٹر کے ساتھ ہمارے نام کی تختی میں پروفیسر کا بھی اضافہ ہوگیا۔ اب ڈاکٹر بندے علی صاحب ہمارے لنگوٹیے بزرو ہوگئے۔ جن کے ساتھ ہم ٹھاٹھ سے یونیورسٹی جاتے، اسٹاف کلب میں برج کھیلتے ہیں اور پالیٹکس لڑاتے ہیں۔''

(ہم نے ریسرچ کی، مضامین پاشا، 159، 160)

احمد جمال پاشا کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گردو پیش کی زندگی سے ہی موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس ہر ریسرچ اسکالر کو اس کی آنکھوں دیکھی کہانی معلوم ہوگا۔ اسی طرح سے ان کا مضمون ''ادب میں مارشل لا'' بالکل آج کی روداد معلوم ہوتی ہے۔ جس سے ہر ادیب ودانشور بخوبی واقف ہے۔ اسی مضمون کا ایک اقتباس دیکھیے:

اگر مقالہ نگاروں کے نام اڑا دیے جائیں تو وہ سب کسی ایک ہی نومشق طالب علم کی تحریریں معلوم ہوں، ایک ہی بات کو بار بار کہنے کا مرض عام ہوگیا تھا، اس استادانہ پینترے بازی میں ممتاز نقاد نے تو کمال ہی کر دیا۔ ان حضرات نے کسی زمانے میں مومن پر ایک مقالہ لکھا، جس کی بڑی واہ واہ ہوئی، کچھ عرصے بعد انھوں نے اسی مقالے کو پھر نئے عنوان سے شائع کرا دیا اور پھر واہ واہ مچ گئی فوجی حکام نے جب ان کے گھر پر چھاپہ مارا تو ان کی کل کائنات ادب یعنی ''مومن'' پر مقالہ برآمد کرلیا گیا۔ فوجی حکومت کے اعلانیے کے مطابق پہلے اس مقالے کا عنوان صرف ''مومن خاں مومن'' تھا، جس کو انھوں نے حسب ذیل عنوانات سے متعدد بار چھپوایا جو ذیل کی فہرست سے، بخوبی واضح ہوسکتا ہے:

''حکیم مومن خاں مومن''، ''مومن خاں مومن''، ''مومن کی شاعری''، ''مومن کی غزل گوئی''، ''مومن شاعری کے آئینے میں''، ''مومن بحیثیت شاعر''، ''مومن اور ان کی شاعری''، ''مومن کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ''، ''مومن ایک مطالعہ''، ''مومن میری نظر میں''، ''مومن اردو شاعری کی نظر میں''،

"مطالعہ مومن"، "اردو شاعری کی نظر مومن پر"، "مومن شخصیت اور شاعری"، "مومن اور تصوف"، "مومن کا محبوب"، "مومن کا لب ولہجہ"، "مومن اور ہم"، "مومن"، "مومن اور میں"، "مومن -ایک سوال"، "کیا مومن شاعر تھے؟" (ادب میں مارشل لا،مضامین پاشا،ص71)

جمال پاشا کے ترکش میں ہر طرح کے تیر ہیں،اس لیے یہ گمان کرنا غلط ہے کہ وہ نقادوں،شاعروں،طالب علموں،اداکاروں،سیاست دانوں اور دکان داروں وغیرہ کے لیے ہی مخصوص ہیں۔ان کے یہاں طنز کی بہت فراوانی نہیں ہے بلکہ مزاح زیادہ محسوس ہوتا ہے۔کہیں کہیں جہاں طنز ہے بھی تو وہاں ان کی شگفتگی،ہمدردانہ رویہ اور ظرافت کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔اس لیے اس کی کاٹ محسوس نہیں ہوتی۔اس تعلق سے پروفیسر وہاب اشرفی نے بھی اشارہ کیا ہے:

"احمد جمال پاشا احتجاجی مزاحیہ نگار ہیں،لیکن ان کا احتجاج چیخ نہیں ہے۔اشارے اور کنائے کے ساتھ ساتھ واقعات و سانحات کے شیریں کیپسول میں چھپا ہوتا ہے،اور آئی۔ان جیک کی تعریف پر منطبق ہے کہ

Satire is born of the instinct to protest;
it is a protest which becomes art.

احمد جمال پاشا بھی اپنے احتجاج کو فن کی سطح پر لے جاتے ہیں،ورنہ وہ محض احتجاجی ادیب ہوتے فنکار نہ ہوتے۔"

(مقدمہ پتیوں پر چھڑکاؤ،ص8)

اسی مقدمے میں وہاب اشرفی نے بھی لکھا ہے کہ احمد جمال پاشا جو چہرے ہمارے سامنے رکھتے ہیں،حمق کی جس کیفیت ہمیں آگاہ کرنا چاہے ہیں،ہم ان سے آگاہ اور آشنا ہو جاتے ہیں،ان کے اس فنکارانہ رویہ سے کسی کا دل بھی نہیں دکھتا،پاشا اور کئی دوسرے طنز وظرافت سے وابستہ ادیبوں میں حد فاصل بھی یہی ہے،پاشا چاہے مسخ شدہ چہرے دکھائیں یا کسی واقعے کی سفاکانہ صورت سامنے لائیں قاری ہنستے ہنستے ہی سب کچھ دیکھ لیتا ہے،اب وہ اس کو سمجھ کر بھی اس پر کام نہ کرنا چاہے تو اس میں تخلیق کار کا کیا قصور۔لیکن ان کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا نہیں ہے۔ہنسنے ہنسانے کا کام تو چٹکلوں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر کی کلید صرف حظ آمیز گفتگو یا محض ہنسانے تک ہی محدود نہیں ہے،بلکہ وہ معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی بڑی مہارت سے کر جاتے ہیں،اور ان کا فن یہ بھی ہے کہ وہ شئے کو مسخ نہیں کرتے نا اس سے نفرت یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں،بلکہ اس پر جمی دھول کو صاف کر جاتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ اس کو داغدار بنائیں،یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس شئے کا نقص دور کر کے اس کا روشن چہرہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔عابد سہیل کا یہ اقتباس بھی کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے:

> ان کے ابتدائی مضامین تبسم زیر لب سے خندہ دندہ نما کا سبب بنتے تھے۔ان مضامین میں انھوں نے اٹھکھیلیوں،رعایت لفظی اور ہم قافیہ،ہم صورت الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔دوسرے دور میں مضحک صورت حال اور واقعات بھی ہم رکاب ہو گئے ہیں اور اسی مناسبت سے زبان کی اٹھکھیلیوں کی کمی متوجہ کرتی ہے۔لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ الفاظ کی بازی گری سے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکتا اور انھوں نے اپنی فکر اور قلم کا رخ طنز نگاری کی طرف موڑ دیا،جس کے چند بہت عمدہ نمونے ان کے آخری مجموعہ مضامین "پتیوں پر چھڑکاؤ" میں ملتے ہیں۔ان مضامین کے رنگ چوکھے ہیں اور طرز اظہار امکانات کی وسیع دنیا لیے ہوئے ہے لیکن اسے پوری طرح بروئے کار لانے کی

زندگی نے انھیں مہلت نہ دی۔ جمال زندگی کی اس منزل میں تھے، جہاں تجربات، فنی ریاض اور علم کی آمیزش کے سبب شاہکاروں کی تخلیق متوقع تھی لیکن یہ نہ ہوسکا۔

(مقدمہ مضامین احمد جمال پاشا، مرتبہ عابد سہیل، ص 7، 8)

غرض یہ کہ اس سے انکار ممکن نہیں کہ احمد جمال پاشا کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھیں عمر تو کافی مختصر ملی لیکن انھوں نے ایسا ادب تخلیق کیا جس کا شمار ادب عالیہ میں کیا جاتا ہے۔ ہمارے دانشوروں کے نزدیک یہ خیال عام رہا ہے کہ مزاحیہ ادب کو ادب عالیہ کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا، لیکن کچھ مزاح نگاروں کی تحریریں، جن میں احمد جمال پاشا کی تخلیقات بھی شامل ہیں وہ ناقدین کے اس خیال کی تردید کرتی ہیں۔ احمد جمال پاشا کے تعلق سے عابد سہیل کا یہ جملہ بھی غور طلب ہے کہ پاشا کا مزاح صرف ادب تک ہی محدود نہیں ہے، وہ کبھی کبھی اسے علم کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں اور ان کا کمال فن یہ ہے کہ علم اور مزاح دونوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ احمد جمال پاشا کے تعلق سے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے ادبی فتوحات کا جائزہ لینے کے لیے پورا ایک دفتر درکار ہے۔ کچھ مضامین یا چند کتابوں پر اکتفا کرنا کافی نہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تحریروں کا بغور مطالعہ کر کے اس پر تفصیلی بحث کی جائے۔

□□□□

Mahar Fatima
A007, Saranya Sarovar Apartment
Hagadur Main Road,
Whitefield
Bengaluru-560066 (Karnataka)
9555949032
meharekta88@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

نصرت پروین

جدید شاعر فضیل جعفری

بیسویں صدی میں نئے لکھنے والوں یا جدید شاعروں میں جن لوگوں نے نمایاں شہرت و مقبولیت حاصل کی ان میں وزیر آغا، باقر مہدی، جاں نثار اختر، عزیز قیسی، بشر نواز، یعقوب راہی، محمد علوی، محمود ایاز، ندا فاضلی، شمس الرحمٰن فاروقی، زبیر رضوی، پرکاش فکری، صدیق مجتبیٰ، عتیق اللہ، شمیم حنفی، عمیق حنفی، کرشن موہن، مخمور سعیدی، محمود ہاشمی، مظہر امام، شہریار، شجاع خاور بانی وغیرہ اور بھی بہتوں نام ہیں جن کے ساتھ ایک اور معتبر نام فضیل جعفری کا بھی شامل کیا جا سکتا ہے لیکن ان کو شاعری میں نظر انداز کر دیا گیا بلکہ ان کی اس طرح پزیرائی نہیں ہو سکی جس کہ وہ مستحق تھے۔

فضیل جعفری نے جدید نقاد کے طور پر ہندو پاک میں اپنی قابلیت کا لوہا تو منوا لیا، تھا شاید اس لیے بھی ان کی شاعری کو ایک سرے سے لوگوں نے فراموش کر دیا۔ ان کے ہم عصر نقاد شمیم حنفی، عتیق اللہ اور چند لوگ ہیں جنہوں نے جدید شاعروں کی فہرست میں ان کا نام لیا ہے اس کے علاوہ شاید ہی کسی نے ان کی شاعری پر گفتگو کی ہو یا ان کی غزلوں کو جدید غزل میں شامل کیا ہے۔ بہر حال فضیل جعفری نے اپنے اہم معاصر ناقدین وزیر آغا، باقر مہدی، وارث علوی، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر حنفی، شمیم حنفی، عتیق اللہ، صادق، اور حامدی کاشمیری جیسے بڑے ناموں میں، گوپی چند نارنگ کو چھوڑ کر ان تمام حضرات کی طرح اپنے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے بھی اپنے معاصرین کی طرح ہی اس صنف کو چھوڑ کر تنقید کی دنیا ہمیشہ کے لیے آباد کر لی۔

فضیل جعفری اپنی شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے 1958 سے باضابط طور پر غزلیں کہنے لگے تھے۔ ابتدائی دور میں ان کی کچھ غزلیں رسالہ 'شاعر' اور 'شاہکار' میں چھپی بھی تھیں۔ اس کے بعد ان کی غزلیں رسالہ 'اظہار'، 'تشکیل'، 'تکمیل'، 'سوغات'، شب خون اور 'جواز' میں شائع ہوتی رہیں۔ زبیر رضوی کے رسالہ 'ذہن جدید' میں بھی ان کی غزلیں اور تحقیقی و تنقیدی مضامیں شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہاں سے بھی ان کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ فضیل جعفری کی شاعری کے دو مجموعے منظر عام پر آئے۔ پہلا 'رنگ شکستہ' 1980 دوسرا 'افسوس حاصل کا' 2009۔ ان دونوں شعری مجموعے میں ۵۷، ۵۷ غزلیں شامل ہیں۔ ایک شعری مجموعے کے بعد دوسرے شعری مجموعے کی اشاعت میں جو 29 سال کا طویل وقفہ ہے اس کی دو بڑی وجہ ہو سکتی ہے پہلی یہ کہ فضیل جعفری کو کتابیں شائع کروانے میں کبھی عجلت نہیں تھی بلکہ اس معاملے میں یہ بہت سست مزاج تھے۔ دوسری یہ ہو سکتی ہے کہ اس دورانیہ تنقید کے میدان میں کام کرنے لگے اور نمایاں کارنامہ انجام دیا۔

فضیل جعفری کی شاعری کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر جاننے اور سمجھنے کے لیے ان کے عہد کے شعری مزاج کو نظر میں رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ عہد جدیدیت کے نام سے موسوم ہے اور فضیل جعفری جدیدیت کے علمبرداروں میں ایک منفرد اور بڑا نام ہے۔ جنھوں نے اس میدان میں اپنا ایک الگ مقام بنایا اور ٹھوس نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کا یہ قائم کردہ تصور تاریخی، فلسفیانہ اور ادبی ہے۔ انھوں نے کسی بڑے نقاد کی کبھی پیروی نہیں کی اور نہ ہی کسی کا دامن اپنے لیے تھامے رکھا۔ شاعری میں بھی کبھی تیکھے، کڑوے، سادہ اور آسان زبان میں اعلی عہدے پر فائز حضرات کو خوب نشانہ بنایا ہے جن میں کاروبار، تعلیم، معاشرہ، انتظامیہ کے ساتھ بڑی

یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ شامل ہیں۔ آل احمد سرور کی طرح ان کے لیے بھی جدیدیت ایک اضافی شئے ہے، لیکن ان کا یہ خیال کہ جدیدیت کی اندھی پرستش کرنے کے علاوہ معروضی مطالعہ زیادہ اہم ہے، یہ غور طلب ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں جدیدیت کی وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جس کی روشنی میں انھوں نے اس میلان کی ضرورت اور قدر و اہمیت کو سمجھا اور اس میلان کے تحت ہی اپنے اظہار و خیال کا ایک منفرد اسلوب پیش کیا۔ اور دیکھا جائے تو ان کی شاعری کا زمانہ بھی جدیدیت کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری پر اس میلان کے گہرے اثرات ظاہر ہوئے ہیں۔ جس میں سماجی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی سطح پر ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی نشاندہی بہت آسانی سے ہوتی ہے۔

فضیل جعفری کی شاعری کی جڑیں ان کی زندگی اور ان کے قومی شعور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری میں جو خیالات سامنے آئے ہیں وہ سماجی، سیاسی اور فلسفیانہ وجود کے ساتھ ساتھ تصور عشق، تصور غم، تہذیبی اقدار، سیاسی شعور، بے خانمائی کا احساس اور انوکھے اسلوب سے بھرپور اپنے عہد کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام چیزوں پر ان کے یہاں انسانی زندگی میں فرد کی ذاتی تنہائی کا عکس بہت گہرا ہے۔ ان کیفیات کی ایک جھلک فضیل جعفری کی شاعری اور اس عہد کے نمایاں جدید شاعروں کے یہاں بھی جھلکتی ہیں اب دیکھیے کہ ایک ہی خیال کو کس انداز میں برتا گیا ہے، جس سے فضیل جعفری کے شعری اسالیب کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ سب سے قبل فضیل جعفری کے اشعار دیکھتے چلیں:

کیوں کھینچتے ہو دار پہ لوگوں ہمیں کہ ہم
زندہ ہیں جس صدی میں وہ کیا کم ہے دار سے
کیسا مکاں؟ سایۂ دیوار بھی نہیں
جیتے ہیں زندگی سے مگر پیار بھی نہیں

س درجہ ہے اداس دلِ زار، شامِ ہجر
جھونکا خنک ہوا کا، دلاسا دکھائی دے

اب دیکھتے ہیں کہ ممتاز جدید شاعروں کے یہاں جدید شاعری جو زندگی کی سیاہ صورت کی ترجمانی کرتی ہے اس میں نئی زبان کا استعمال، روایتی ڈکشن سے انحراف، پرانی ترکیب سے پرہیز، علامتوں کا ایک منفرد رنگ، نیا پیرایہ بیان، نئے مفاہیم اور تجربے کس طرح سے ان کے ہم عصر جدید شاعروں کے یہاں الگ جوہر دکھاتے ہیں، جن لوگوں کے یہاں خیال ایک ہے پر رنگ جدا ہیں۔ ان کے عہد کی عکاسی کے لیے جن لوگوں کو نمایاں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں شہریار، بشیر بدر، شاذ تمکنت، وزیر آغا، باقر مہدی، عمیق حنفی اور ندا فاضلی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اس پورے عہد میں انسانی زندگی کو سب سے زیادہ جس چیز نے حیرت میں ڈالا وہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر سے اعتماد کھو جانا تھا۔ ہجوم میں ہونے کے باوجود بھی تنہائی کے سائے میں گھرے رہنا گویا خوف و دہشت ان لوگوں کا مقدر بن گیا اور ہر انسان تنہائی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ یہ تنہائی کا جو معاملہ ہے یہ انسان کی داخلی اور خارجی دونوں تنہائی کا رہا ہے۔ داخلی میں انسانی وجود کو ہی سب کچھ مانا گیا اس لیے جدید شاعروں کے یہاں فلسفہ وجودیت کا ہی قبضہ مستحکم ہے اور خارجی دنیا میں پھیلی ہوئی وہ تمام چیزیں جس کا اثر کسی نہ کسی صورت انسانی زندگی پر پڑتا ہے۔ اس تعلق سے فضیل جعفری کا کلام اور ان کے ہم عصر یا اسی طرز احساس پر ندا فاضلی کا کلام ذہن میں آتا ہے: ملاحظہ کریں:

ہر آدمی میں تھے دو چار آدمی پنہاں
کسی کو ڈھونڈنے نکلا، کوئی ملا مجھکو
ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

فضیل جعفری کی زندگی کا مطالعہ ان کی شاعری کی طرح ہی جہاں ایک طرف دلچسپ ہے وہیں دوسری جانب بہت سے اضطراب کا یکجا سنگم ہے۔ دلچسپ اس معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک بڑا ہی ذہین انسان جو انگریزی اردو اور ہندی ادب کا مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنا منفرد نظریہ بھی رکھتا ہے اسے وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کے علاوہ جس کی شخصیت کے بھی کئی پہلو ہوں اور جو اپنے آپ میں ایک خاموش سمندر کی مانند ہو۔ فضیل جعفری کی اصل شخصیت اور تحریری صلاحیت میں مضمر قابلیت تک چند لوگوں کی رسائی ہوئی۔ اور ان میں بھی بہت کم لوگ ایسے تھے جو فضیل جعفری کی زندگی کا حصہ بنے۔ کچھ تو ان کی زندگی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر اسلم پرویز، خلیق انجم، زبیر رضوی، نور جہاں ثروت اور محبوب الرحمٰن فاروقی۔

دوسری جانب اضطراب کا یکجا سنگم اس معنی میں ہے کہ فضیل جعفری نے اپنی زندگی میں جو گہرے اور تلخ مشاہدے کیے یا تاریخی واقعات کے اثرات جو ان کی زندگی پر پڑے اس کی پوری جھلک ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ایسے موقعے پر آل احمد سرور کے ایک مضمون 'ادب میں اظہار و ابلاغ کا مسئلہ' میں جس طرح انھوں نے جدید شاعر اور جدید شاعری کو سمجھنے کے لیے جس اہم نکات کی جانب اشارہ کیا ہے ان

میں آل احمد سرور کا یہ خیال کہ ''جدید شاعری پر جو سب سے زیادہ توجہ دی ہے وہ اس دور کے شاعر کا اپنا وژن اور شخصی نظر کو سمجھنا ہی اس دور کی شاعری کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ فضیل جعفری پر یہ قول فٹ بیٹھ جاتا ہے، یہی خوبیاں ان کی شاعری کی شناخت بھی ہیں۔

میں اس کا ہوں کتنا ،اسے پتا ہی نہیں
وہ اپنے جسم کی آواز،سن سکا ہی نہیں

جلتے ہیں تیرے لمس کی خواہش کی آگ میں
آنکھوں کے پاس اشک نہیں جو بہا سکیں

رکھا تھا ہاتھ قبر پہ اس کی مگر فضیل
لگتا ہے جیسے ہاتھ ملاکر ہم آئے ہیں

آنکھیں کسی سے چار ہوئیں وقت تھم گیا
وہ وقت سچ کہوں تو عبادت کی طرح تھا

فضیل جعفری کی شاعری عموماً احساس و جذبات کی شاعری ہے لیکن تاریخی واقعات و اثرات کو بھی جگہ جگہ پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر انھوں نے جمشید پور کے فسادات میں مشہور ترقی پسند تخلیق کار ذکی انور کی بہیمانہ قتل سے متاثر ہو کر جو اشعار قلم بند کیے ہیں وہ تاریخی فسادات میں بربریت کا عمدہ مظاہرہ ہے جس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔ فضیل جعفری کی راہ حالات کی سختیوں نے ان کو جس طرح سنوارا اس واقعے کی جھلک ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے۔ جس کو انھوں نے کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ ان کے اندر ندرت اظہار کا ایک عمدہ نمونہ بھی نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری فکر انگیز ہونے کے ساتھ ایک تازگی اور انفرادیت کا احساس دلاتی ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو شاعری کے لیے فضیل جعفری کے یہ دو شعری مجموعے ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر لحاظ سے یہ اپنی انفرادیت کے معنی میں اہم اور پرکشش ہیں۔ سیاسی شعور کی ترجمانی کے لیے چند اشعار اور ملاحظہ کیجیے:

اب نہ وہ گیت، نہ چوپال، نہ پنگھٹ، نہ الاؤ
کھو گئے شہر کے ہنگاموں میں دیہات میرے
برسوں سے جلتی ریت پر ہیں اہلِ دل کھڑے
بیٹھے ہیں کرسیوں پہ منافق بڑے بڑے
سخت ،زہریلے طمانچے، حادثوں کی شکل میں
زندگی نے پے بہ پے مارے مرے رخسار پہ

فضیل جعفری کے شعری مجموعے سے یہ چند منتخب اشعار ہیں محض جس سے ان کی پوری شاعری کا احاطہ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ اور اسالیب کی جھلک ضرور دیکھی جا سکتی ہے۔ جس سے قاری کے اندر اتنی تجسس تو ضرور پیدا ہوگی کہ ان کے شعری مجموعے پر کم از کم ایک بار غور کیا جائے۔ ان کی غزلوں میں محبوب کا جو تصور ہے وہ حقیقی نہیں خیالی ہے لیکن اس بیان میں جو لطافت، شگفتی، رعنائی و رنگینی نظر آتی ہے وہ فضیل جعفری کا پرتو ہے۔ تہذیبی اقدار کا جہاں معاملہ ہے اس میں اپنے تہذیبی ورثہ کو مٹنے کا دکھ درد اور زندہ رکھنے کا جذبہ ان کے یہاں بہت قوی ہے، جس نے ان کی شاعری میں شدت اور شعور دونوں کو نمایاں کیا ہے۔

جیسا کہ ان کے دو شعری مجموعے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے سیاسی رنگ و آہنگ میں ان کے تجربے ذاتی ہیں۔ مگر ان تجربوں کے اظہار میں جو خوبیاں ان کو زیادہ اہم اور الگ دکھاتی ہیں ان میں جذبہ، جمال اور سیاسی آزمائشوں کے باوجود صبر آزما کردار کا بیان ان کی شاعری کو مزید نکھار دیتا ہے۔ کیونکہ بعض اشعار کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی جس سیاسی پریشانیوں کا انھوں نے خود پر تجربہ کیا تھا وہ ان کی شاعری میں جاری و ساری ہے لیکن مایوسی کا رنگ مزید گاڑھا نہیں ہے کہیں نہ کہیں امید کی کرن نظر آتی ہے۔

بادۂ درد ،خم اشک، کتاب گریہ
ہم نے سامانِ سفر حسبِ مشاغل باندھا

اب اور کیا بتائیں بس اتنا سمجھ کہ ہم
بارش کے انتظار میں گم سم درخت ہیں

سو مسئلوں میں ہو گئے تقسیم ہم فضیل
زندہ تو ہیں مگر ورق لخت لخت ہیں

گھر سے بے زار ہوں، کالج میں طبیعت نہ لگے
اتنی اچھی بھی کسی شخص کی صورت نہ لگے

جو انسانی محبت، دکھ درد اور اس دور کے احساسات کو بڑے خوبصورت انداز میں ابھارتی ہے۔ اس میں جو کیفیتیں دل پر طاری ہو سکتی ہیں اسی کو بغیر کسی تصنع کے نہایت سادہ اور پر اثر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کی شروعات سے لے کر آج تک سائنسی ترقی کے

میدان میں ہر روز نئی نئی تبدیلیاں اور کامیابیاں ہورہی ہیں۔فضیل جعفری کے لیے جہاں یہ ایجادات نے مادی آسائشوں سے لوگوں کو ہمکنار کردیا وہیں اس حقیقت سے منہ نہیں چرایا جاسکتا کہ لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیا گیا، اوراب اس سے نجات کا کوئی راستہ شاعر کو نظر نہیں آتا۔معاشرے میں عجیب وغریب مسائل ابھرنے لگے جس کے نتیجے میں ان کی شاعری کا انسان تمام تر مادی کامیابیوں اور جدید ترین آسائشوں کے باوجود خود اپنے وجود میں گم ہوتا چلا گیا۔جدید شاعری میں ایسی حیرت ناک ترقی اور ایجاد سے آنے والی نسلوں نے کتنا فائدہ اور نقصان حاصل کیا اس سے فضیل جعفری نے نثر اور شاعری دونوں صنف میں پردہ اٹھایا ہے۔لیکن اسی خوف اور کم مائیگی کے ماحول میں جینے کی آس شاعر کو ہوتی ہے جو ان کے یہاں بھی موجود ہے۔بے خانمائی کا احساس بھی فضیل جعفری کی شاعری میں شدید ہے اس سلسلے میں اشعار دیکھیے:

پانی کی طرح پھیل گئی گھر میں شام ہجر
تا صبح ڈوب ڈوب کے ابھرا کرے کوئی

بہتی ہیں رگ و پے میں دو آبے کی ہوائیں
اک اور سمندر ہے سمندر سے پرے بھی

جو بھر بھی جائیں دل کے زخم دل ویسا نہیں رہتا
کچھ ایسے چاک ہوتے ہیں جو جڑ کر بھی نہیں سلتے

فضیل جعفری کا فلم نگری بمبئی سے بہت گہرا تعلق تھا۔انھوں نے اس نگری کے کئی اتار چڑھاؤ دیکھے اور کئی بڑی شخصیات جن میں مینا کماری، نرگس، مدھو بالا، بلراج ساہنی وغیرہ کو قریب سے دیکھا۔یہ ان کے عروج وزوال کی اگر تاریخ لکھنا چاہتے تو ضرور لکھ سکتے تھے۔لیکن ان کو اس میدان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔حالانکہ فکرِ معاش میں شروع کا دوران کا بڑا دربدری کا گزرا پھر بھی درس وتدریس کو ہی اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنائے رکھا۔1960 میں باقاعدہ طور پر جدیدیت کا رجحان سامنے آ گیا تھا اور جدید شعراء نے بھی اپنے لیے نئی غزلیہ زبان وضع کرلی تھی۔اس نئی زبان میں فضیل جعفری نے شعری محاوروں کی ساخت ،پیکر نگاری، علامت، استعارہ، تشبیہ اور نئے الفاظ کا استعمال وغیرہ ایسی متعدد خصوصیات ہیں جس نے نئی غزل کو یکسر ایک نئے لسانی منظر نامے سے روشناس کرایا تھا اور ان ہی خوبیوں کا استعمال فضیل جعفری نے اپنے شعری مجموعے میں بھی کیا ہے۔'رنگِ شکستہ' اور 'افسوس حاصل کا' کی لفظیات میں کم وبیش ایک ہی جھلک نظر آتی ہے۔انفرادی پیرایہ بیان میں کہنے کی شعوری کوشش دونوں میں یکساں ہے۔ایک کمی جو ان کے یہاں نظر آتی ہے وہ یہ کہ ایک تخلیقی سطح پر لفظیات کی تکرار نے شاعری میں بعض اوقات بوریت پیدا کردی ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دونوں مجموعے میں موضوع کی یکسانیت نے غزلوں کے اسلوب اور مختلف پیرایہ اظہار میں منفرد ہونے کے باوجود ان کی جڑیں آپس میں پیوست نظر آتی ہیں۔ گویا ایسا لگتا ہے کہ ایک ہی موضوع کو بار بار دہرایا جا رہا ہے۔اس موقعے پر شاید شاعر کی نگاہ میں ایک بات یہ بھی ہوسکتی ہوگی کہ انھوں نے ایک ہی خیال کو الگ طریقے سے جہاں پیش کیا ہے وہ ایک واقعے کو بیان کرنے کے لیے ایک دوسرے واقعے کو بنیاد بنایا گیا ہو۔جسے دونوں کے تشبیہی عمل سے بات کو انوکھے اور موثر اسلوب میں بیان کرنا چاہتے ہوں لیکن فضیل جعفری اگر نظمیں لکھتے تو یہ چیزیں مزید نکھر سکتی تھیں۔بہرکیف ان مثالوں اور تجزیے سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو انھوں نے کامیاب استعاراتی اظہار کا ایک جہاں ضرور آباد کیا ہے جس میں زندگی کی روزمرہ کام آنے والی اشیاء کو ظاہر کیا گیا ہے۔جدید غزل کے مروجہ استعاروں مثلا گھر، موج، دریا، سمندر، پانی، دھوپ، جزیرہ، سناٹا، لمحہ، عکس، صدا، پانی وغیرہ کثرت سے شامل کیے گئے ہیں لیکن ان ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اور مروجہ استعاروں کو نئے معنی میں استعمال بھی کیا گیا ہے۔ان لفظیات کے مآخذ زندگی کے عام بول چال کے الفاظ ہیں جو آس پاس کی اشیاء اور مناظرِ فطرت کی وہ تصویریں ہیں جو ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی رہتی ہیں، لیکن جن پر عام آدمی کی توجہ نہیں جاتی۔فضیل جعفری کی لفضیات میں ایک خاص چیز یہ ہے کہ شاعر کا تعلق اپنے اردگرد اور مناظر سے اتنا گہرا ہے کہ جذبات کی تمام تر لفظیاتی دنیا بڑی پرکشش معلوم ہوتی ہیں۔عربی، فارسی الفاظ کے بجائے عام زندگی کے الفاظ کو غزل کے آہنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس طرح ان تمام خوبیوں کے ساتھ فضیل جعفری کو جدید شاعروں کی فہرست میں شامل کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔

□□□

Nusrat Perween
B-154,4th Floor,
AbulFazal, Part1
New Delhi-110025
MobileNo-9015133636
Email-nusrat.rizwan07@gmail.com

شیریں فاطمہ

فاطمہ تاج کی ادبی خدمات

حیدرآباد کے کامیاب اہل قلم شعراء وادباء کی فہرست میں فاطمہ تاج کا نام پہلی صف میں شامل ہے۔ وہ ایک عبقری شخصیت ہیں جنھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں بیش قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے۔ سیدہ فاطمہ تاج النساء دنیائے شعروادب میں فاطمہ تاج کے نام سے مشہور ومعروف ہیں۔ فاطمہ تاج 25 اکتوبر 1948 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد کا نام سید حسن جمال البل اور والدہ کا نام زبیدہ خاتون تھا۔ 1962 میں ان کی شادی حبیب احمد بالفقیہ سے ہوگئی تھی۔ شعروشاعری کا شوق ان کو بچپن سے ہی تھا جیسا کہ وہ ایک جگہ خود بتاتی ہیں:

> ''چھوٹی سی عمر میں ننھی منی غزلیں لکھ لیتی جو آداب شاعری سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے بے وزنی کا شکار رہتیں۔ میرے والد نے اس سلسلے میں سید احسان علی عرشی (مرحوم) کو بحیثیت استاد مقرر کیا تھا''

(ص 7، امانت، فاطمہ تاج، اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد، 1993)

احسان علی عرشی کے علاوہ فاطمہ تاج نے امیر احمد خسرو سے بھی شعر گوئی پر اصلاح لی۔ امور خانہ داری میں مشغول ہونے کے سبب ان کا لکھنے کا شوق درمیان میں رک گیا تھا لیکن انھوں نے مطالعہ جاری رکھا اور 30 سال بعد پھر سے اپنے ادبی سفر پر گامزن ہوئیں۔ بقول فاطمہ تاج:

> ''میں نے اپنے اس قلمی سفر کا آغاز کر دیا تیس سال بعد میں پھر اسی مقام پر آ گئی جہاں شوق ادب کی چنگاریاں شعلہ بننے کو بے قرار تھیں۔'' (ایضاً)

فاطمہ تاج روزنامہ "سیاست" میں تحریریں لکھا کرتی تھیں جس نے انھیں لوگوں سے بحیثیت ادیبہ متعارف کرایا۔ بعد میں ان کا کلام "شب خون"، "شعر و حکمت" اور "سب رس" میں بھی شائع ہونے لگا۔ فاطمہ تاج کو یوں تو قدرت نے ہی فنی صلاحیتیں بخشی تھیں اس کے ساتھ ہی ان کے شعری و ادبی شعور کو حیدرآباد میں منعقد ہونے والی "محفل خواتین" نے بھی نکھارا۔ 9 جون 1990 کو منعقد ہونے والے "محفل خواتین" کے ماہانہ جلسے میں پہلی بار فاطمہ تاج نے شرکت کی اور پھر مسلسل ان اجلاس میں شرکت کرتی رہیں۔ وہ آل انڈیا ویمنز ایسوسیشن حیدرآباد کی جنرل سیکرٹری رہیں اور ساتھ ہی 1997 میں شروع ہونے والی فلورا ویمنز سوسائٹی کے فاؤنڈر پریسیڈنٹ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ علاوہ ازیں "انجمن خواتین"، "بزم خواتین"، "مسلم ایجوکیشن" جیسی تنظیموں کی بھی ممبر رہیں۔ فاطمہ تاج بنیادی طور پر غزل گو شاعرہ تھیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار، انشائیہ نگار، مضمون نویس، خاکہ نگار، نعت گو، طنز و مزاح نگار اور ناول نگار بھی تھیں۔ یعنی وہ ایک ہمہ

جہت شخصیت تھیں جنھوں اردو ادب کی خوب خدمت کی۔ 19 جنوری 2020 کو فاطمہ تاج نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

فاطمہ تاج کے آٹھ شعری مجموعے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی نثری تصنیفات میں ایک ناولٹ بعنوان "وہ "اور دو ناول "جب شام ہو گئی" اور "نقش آب" ہیں۔ "امانت" (1993) ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان سب کے علاوہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ہیں:- "دلاسہ "(1993) اور "من مانی"۔ علاوہ ازیں فاطمہ تاج کے تین افسانوی مجموعے ہیں:- "آس پاس" (1993)، "چھاؤں کی چادر دھوپ کی کلیاں" (2002) اور "موسم کی طرح رشتے"۔انھوں نے خود نوشت بھی لکھی ہے جس کا عنوان ہے "عمر رواں"۔ فاطمہ تاج کو ان کی ادبی خدمات پر متعدد اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔اُن کے افسانوی مجموعے " آس پاس" پر اُنہیں اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا اور مجموعی ادبی خدمات پر اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اُن کی شعری وادبی خدمات پر اُنہیں "امتیاز میر" سے نوازا گیا جس کے بارے میں ڈاکٹر صفیہ لکھتی ہیں:

''یہ امتیاز پہلی بار ایک خاتون خانہ کو ملا ہے۔''

(ص6، چھاؤں کی چادر دھوپ کی کلیاں، فاطمہ تاج، عائش آفسیٹ پریس حیدرآباد، 2002)

انھیں مجموعی خدمات پر اردو اکیڈمی آندھر پردیش ایوارڈ کے علاوہ ساہتیہ ادب دہلی سے مدر ٹیرسہ ایوارڈ، آندھرا پردیش لینگویج کمیشن سے "باوقار ایوارڈ" جیسے اعزازات بھی دیے گئے۔ان کے طنز ومزاحیہ مضامین کے مجموعے "من مانی" پر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش ایوارڈ عطا کیا گیا۔ فاطمہ تاج نے جب اپنے شروعاتی دور میں غزلیں لکھنا شروع کیں تو وہ علامہ اقبال کی زمینوں میں شعر کہا کرتی تھیں۔غزل کی روایت کی پیروی سے شروع ہونے والے اس سفر میں رفتہ رفتہ انھوں نے نئے لب ولہجے سے اپنا منفرد مقام حاصل کیا۔ان کی غزلیں کلاسیکیت ، دلکشی، نغمگی، بے ساختگی، برجستگی اور روانگی جیسی خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔وہ ایک زود گو شاعرہ ہیں لیکن زود گوئی ان کے فن کی چمک کو دھندلا نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے کم وقت میں ان کی مندرجہ بالا تصنیفات منظر عام پر آئیں اور انھیں اتنا سراہا گیا۔ ان کی زود گوئی کے بارے میں سلطانہ شرف الدین احمد کہتی ہیں:

''غزل کا نہ پوچھیے وہ ان کی تحریر کا لازمی عنصر تھی۔ان کے قلم سے بے اختیار غزلیں ٹپکا کرتیں۔دیکھتے دیکھتے افسانہ تیار ہو جاتا۔وہ زود نویس ہیں۔''

(ص111،اب کے برس، فاطمہ تاج، اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد1992)

اسی ضمن میں صالحہ الطاف رقمطراز ہیں:

''ایسا بھی نہیں ہے کہ زود گوئی میں ان کی شاعری اور تحریروں کو یوں ہی کاغذ پر بکھیر دیا ہے۔تقریباً ہر شعر اپنی بھرپور شعریت کے ساتھ جموہ گر ہے۔''

(ص51،امانت، فاطمہ تاج، اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد1993)

وہ خود اپنی غزل گوئی سے متعلق کیفیات کا بیان اس طرح کرتی ہیں:

"آس پاس کے منظر ذہن کے کینوس پر ابھر آتے ہیں۔غزل رنگین، معطر پیراہن میں رقصاں ہونے لگتی ہے، سازِ حیات کی لو تیز تر ہو جاتی ہے۔۔۔اور پھر صبح کی نرم کرنوں کا اجالا رفتہ رفتہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ روشنی کا جھماکا آنکھوں کو چندھیانے لگتا ہے ہمیں ایسے میں دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے اور ذرا سی دیر میں غزل وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔ "

(ص02،خوشبوئے غزل، فاطمہ تاج، اویس گرافکس حیدرآباد، 1997)

فاطمہ تاج کی شاعری میں وہ نرمی ہے جو قاری کو پہلے مسرور کرتی ہے اور پھر اشعار میں پوشیدہ فکر پر سوچنے کو مجبور کرتی ہے۔انھوں نے اپنے نسوانی جذبے کے ساتھ اپنی شاعری میں داخلیت پیدا کی ہے۔بقول روحی قادری:

''فاطمہ تاج کی شاعری سخن سازی کی نہیں سخنگستری کی

آئینہ دار ہے۔"

(ص51، پھول غزل کے، فاطمہ تاج، اولیس گرافکس حیدرآباد، 1998)

مثال کے طور پر ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

موج طوفاں پھر سمندر سے ہٹا لی جائے گی
اہل ساحل دیکھنا کشتی بچا لی جائے گی

دل کے سمندر پر ہے نقشہ تاج محبت کے گھر کا
پانی پر یہ نقش بنانا سب کے بس کی بات نہیں

شعلے جتنا چاہیں بھڑکیں جتنی چاہیے آگ لگے
اب تو جلنا سیکھ لیا ہے میں نے بھی انگاروں پر

فاطمہ تاج جس طرح ایک ماہر غزل گو شاعرہ ہیں اسی طرح وہ صنف نظم میں بھی کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی نظموں میں تسلسل اور روانی موجود ہے۔ وہ اپنے نظم گوئی کے متعلق اپنے مجموعے "حوصلہ" میں لکھتی ہیں:

''یہ نظموں کا مجموعہ 'حوصلہ' ہر اعتبار سے میرے لیے حوصلے کا مظہر ہے۔ غزل کا مزاج رکھتے ہوئے بھی میں نے اچانک نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ کس طرح لکھیں مجھے خود حیرت ہے۔''

(ص61، حوصلہ، فاطمہ تاج، اولیس گرافکس حیدرآباد، 1997)

فاطمہ تاج کی نظموں میں پیچیدگی نہیں ہے انھوں نے بہت دلکش اور سادہ پیرائے میں اپنے فکر و خیال کو نظم کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ مثال کے طور پر فاطمہ تاج کی نظم "منظر پس منظر" ملاحظہ ہو:

میرے کتبے پہ جانے کیا لکھا تھا
کوئی بیٹھا مسلسل رو رہا تھا
زمین نم تھی، فضا بوجھل تھی لیکن
ہوا میں خوشبوؤں کا ایک دھواں تھا
کسی کے دل میں زندہ ہو گئی میں
اسی لمحہ زمانہ مر چکا تھا!!!

فاطمہ تاج نے شاعری میں اپنے جوہر دکھانے کے ساتھ ہی نثر کی کئی اصناف میں بھی خوشگوار تجربے کیے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں اپنے آس پاس دیکھے گئے مسائل کو پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں نسوانی نظریات و مسائل کی شدت خاص طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ فاطمہ تاج نے اپنے افسانوں میں سادہ زبان استعمال کی اور کامیاب منظر نگاری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ بقولِ ڈاکٹر حسن الدین احمد:-

''ان کے کردار بے جان نہیں جیتے جاگتے انسان ہیں اور فاطمہ تاج نے نہ صرف سنگ راہ کو ٹھوکروں سے ہٹایا ہے بلکہ انھیں بہت دور پھینک دیا ہے۔''

(ص8، آس پاس، اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد، 1993)

ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''آس پاس'' میں 30 اور "چھاؤں کی چادر دھوپ کی کلیاں" میں ۱۷ افسانے شامل ہیں۔ "جیون دھارا"، "شین"، "تیسرا موڑ" اور "ورق ورق زندگی" فاطمہ درج کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ "امانت" ان کے مضامین، خاکے، انشائیہ اور رپورتاژ کا مجموعہ ہے۔ ان کے لکھے رپورتاژ اور خاکے روزنامہ سیاست" میں شائع ہوا کرتے تھے۔ فاطمہ تاج نے "محفل خواتین: میری نظر میں" محفل خواتین میں شرکت کرنے والی خواتین کے تاثراتی خاکے پیش کیے ہیں۔ اُن کے طنز و مزاحیہ مضامین کے مجموعے "دلاسہ" میں 33 مضامین شامل ہیں۔ فاطمہ تاج کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر موضوع پر لکھنے کا ہنر رکھتی ہیں۔ طنز و مزاح کے میدان میں ہر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ فاطمہ تاج نے اپنی ادبی صلاحیتوں کی بنا پر طنز و مزاح کے میدان میں بھی منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ ان کے مضامین شوخی و ظرافت کے اچھے نمونے ہیں بقول ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال:-

"فاطمہ تاج کے مضامین تازگی، شوخی اور بذلہ سنجی کا مرقع ہیں۔ انھوں نے مزاح کو سطحی انداز میں نہیں برتا۔ ان کا غم شرارہ بن کر رگ و پے میں اترتا اور نوک قلم سے کبھی طنز اور کبھی ہلکے مزاح کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔"

(ص7، دلاسا، فاطمہ تاج، اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد، 1993)

اس طرح فاطمہ تاج اردو ادب کی مختلف اصناف میں گل کاریاں کرتی نظر آتی ہیں۔

□□□

Shireen Fatma
Research Scholar
Urdu Department
M.J.P. Rohilkhand University
Pilibhit By Pass Road
Bareilly-243006 (U.P)

شاعرات کے منتخب اشعار

بیاں میں کس سے کروں جا کے اب گلہ دل کا
یہ دل کا دل ہی میں ہوئے گا فیصلہ دل کا

نہیں ٹلتی کسی عنوان سر سے
شب غم بھی کوئی کالی بلا سے

جانی بیگم

تصور اس صنم کا دل میں لائے جس کا جی چاہے
ہماری بات سن کر آزمائے جس کا جی چاہے

محبت کے محل میں عاشق جانباز رہتا ہے
نہیں خالہ کا گھر اس میں جو آئے جس کا جی چاہے

جعفری

جو سنا پاؤں میں سونے کا توڑا اے پری تو نے
مسلسل پائے دیوانہ ہوا زنجیر آہن سے

بدی کی جس نے ہم سے ہم نے اس کے ساتھ نیکی کی
ہماری خوبی ہے یہ، ہم دوستی کرتے ہیں دشمن سے

حور لکھنوی

پہلے یہ چشم عنایت اب یہ نفرت کیوں حضور!
وہ ستم کیوں کر سہے؟ جو لطف کا خوگر ہوا

نالۂ نازاں جو کھینچے روکے میں نے ہجر میں
رشک سے بجلی جلتی، شرمندہ ابر تو ہوا

حسن لکھنوی

دل میں ایک بوند تو رہنے دے لہو کی میرے
چشم خونباز! ترے ہاتھ سے دم ناک میں ہے

نہ سنیے گا کبھی بھولے سے بھی قصہ محبت کا
اڑا دیتی ہے نیند الٹا اثر ہے اس کہانی کا

حسن لکھنوی

ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں
گل کی مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں
مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں

دلہن لکھنوی

قسمت میں ہماری نہ ہوا ہائے صد افسوس
اک روز لپٹ کر شب مہتاب میں سونا

ہے چوکھٹ آپ کی اور سر ہمارا
قیامت تک نہیں ٹکرائیں گے ہم

دلبر دہلوی

تھی طرح دار آپ بھی لیکن
رہ نہ سکتی تھی اچھی صورت میں

میں جانتی تھی آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا
کمبخت کیسی آنکھ لگی دل کو دکھ ہوا

نسیم دہلوی

(شاعرات کا تذکرہ، سن اشاعت درج نہیں، بحوالہ ریختہ ڈاٹ او آر جی)

یہ دل منتظر

نیلوفر سعدیہ

شازل میں کب سے تمہیں پکار رہی ہوں سنائی دے رہا ہے یا نہیں۔" سدرہ نیچے سے اسے آواز لگاتے ہوئے اوپر اس کے کمرے میں آ گئی اور شازل کو دیکھا تو وہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا ہوا دوربین سے آسمان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ سدرہ کی آواز سن کر اس نے مڑ کر سدرہ کو دیکھا اور کہا۔

مجھے آپ کی آواز سنائی نہیں دی آنٹی۔" وہ سادگی سے بولا تو وہ بے حد غصّے میں بولی" آواز سنائی نہیں دی کا کیا مطلب ہے شازل دن بھر کام کروں اور رات میں کھانا کھانے کے لیے تمہیں پکارتی رہوں۔ تم خود کیوں نہیں آتے کھانے کے وقت مجھے اور بھی بہت کام ہوتے ہیں، میرے اپنے بچے بھی ہیں ان کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔" شازل نے سنجیدگی سے سدرہ کو دیکھا۔

مجھے بھوک لگے گی تو میں خود کھا لوں گا آپ فکر نہ کریں آپ اپنے بچوں کا خیال رکھیے۔ آپ کو میری طرف سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" سدرہ غصّے میں ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگی۔

''تو ٹھیک ہے اب سے اپنے ہاتھ سے کھانا بنا بھی لینا اور لے کر کھا بھی لینا۔ سمجھے؟''

''جی''

اس کے سپاٹ لہجے سے جی کہنے پر وہ اور آگ بگولہ ہو گئی اور غصّے سے چلی گئی۔۔۔۔ شازل ایک درد بھری مسکراہٹ لیے پھر سے دوربین سے آسمان کی سمت دیکھنے لگا۔۔۔۔ سدرہ اس کی سگی خالہ تھی اور سدرہ کے دو بچے تھے نادیہ اور حامد۔۔۔۔ نادیہ کالج کی اسٹوڈنٹ تھی اور حامد اسکول میں پڑھتا تھا۔۔۔ برسوں پہلے سدرہ شازل کے گھر کے نچلے حصّے میں رہنے آئی تھی۔ سدرہ کے شوہر کی وفات ہو چکی تھی جس کے سبب شازل کی امی نور، نے اسے اور اس کے بچوں کو اپنے گھر لا کر اپنے گھر میں جگہ دی۔۔۔ شازل جب دو برس کا تھا تب ہی اس کے والد کی وفات ہو گئی تھی، اپنی بہن کا حال اپنی طرح دیکھ کر نور سدرہ کو اپنے گھر لے آئی تھی۔۔۔ نور جاب کرتی تھی اور اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ اپنے بہن اور اس کے بچوں کا بھی خیال رکھتی ان کی ہر ضرورت پوری کرتی اس کے بچوں کو اپنے بچے سمجھتی مگر ایک دن نور ایک کار ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئی اور اس حادثے نے اس کی جان لے لی۔۔۔۔ شازل پوری طرح ٹوٹ چکا تھا اس کی ماں اس کے لیے پوری دنیا تھی تب وہ صرف سولہ سال کا تھا۔۔ وقت گزرتا گیا۔۔۔ شازل نے اپنی پڑھائی مکمل کی اور ایک بڑی کمپنی میں جاب کرنے لگا۔ وقت کے ساتھ سدرہ کا رویہ تبدیل ہونے لگا وہ شازل سے تنگ آ گئی تھی۔۔۔ وہ اپنے سارے کام خود کرتا اپنے کپڑے خود دھوتا کمرے کی صفائی خود کرتا اس نے سدرہ کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ وہ صرف رات کا کھانا نیچے اس کے پاس کھایا کرتا تھا مگر وہ اس سے بھی تنگ آ چکی تھی۔ گھر کا تمام خرچ شازل ہی اٹھاتا حتیٰ کہ حامد اور نادیہ کی پڑھائی کے اخراجات بھی شازل کے ہی ذمے تھے اور تب بھی سدرہ اس سے بے وجہ نفرت کرنے

لگی تھی ۔۔۔شازل بھی اپنا کوئی کام اس سے نہیں کرواتا، اپنے اوپر وہ سدرہ کا کوئی احسان نہیں چاہتا تھا۔۔۔

شازل رات کے وقت اپنی دوربین سے اطراف کے مناظر دیکھ کر وقت گزارتا، آج بھی وہ روز کی مانند دوربین سے آس پاس کے مناظر دیکھ رہا تھا تب ہی اچانک اس کی نظر آسمان میں اڑتی ایک چیز پر پڑی وہ وہ چونک گیا۔۔۔یہ تو ایک آسمانی فانوس (sky lantern) تھا۔شازل نے دوربین سے اسے دیکھا غبارے کی شکل سا اڑتا ہوا فانوس بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔دوربین سے دیکھا تو اس پر کچھ لکھا ہوا تھا جو واضح طور پر نظر نہیں آرہا تھا، اڑتے اڑتے وہ شازل کے گھر کے قریب آرہا تھا شازل بے چین سا ہو گیا اور اپنے دراز سے گلیل نکالی جو وہ حامد کے لیے لے کر آیا تھا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا وہ گلیل لے کر برقی رفتار سے اوپر چھت پر گیا دیکھا تو وہ آسمانی فانوس بالکل اس کے گھر کے اوپر سے گزر رہا تھا اس نے جھٹ سے چھت پر پڑے چھوٹے پتھر لیے اور گلیل سے نشانہ سادھا اور پتھر جا کر سیدھا اس فانوس کو لگا جس سے اس کی آگ بجھ گئی اور وہ تیزی سے نیچے آنے لگا شازل مسکرایا اور جیسے ہی وہ آسمانی فانوس نیچے آیا شازل نے اسے پکڑ لیا اور نیچے اپنے کمرے میں لے آیا۔۔۔

اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے ٹیبل پر وہ آسمانی فانوس رکھا اور اس پر لکھا ہوا پڑھنے لگا۔۔۔اس پر لکھا تھا۔۔۔۔

''یا اللہ،

اگر میرے ابّو آج زندہ ہوتے تو میری امی میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتیں وہ وہ کبھی دوسرا نکاح نہیں کرتیں ۔جب سے انھوں نے دوسرا نکاح کیا ہے وہ مجھے اور میرے ابّو دونوں کو بھول گئی ہیں، اب ان کی ایک الگ دنیا ہے۔وہ میرے ساتھ ہو کر بھی نہیں ہے ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی وہ مجھ سے بالکل بات نہیں کرتیں ۔اب تو مجھے لگتا ہے شاید وہ مجھے اپنی بیٹی ہی نہیں مانتی، اگر مانتی تو کم از کم میرا مایوس چہرہ دیکھ کر میرا حال ہی پوچھ لیتیں ۔۔انکے لیے اب بس ان کے شوہر اور ان کی جاب معنی رکھتی ہے۔۔۔اگر میرے ابّو ہوتے تو میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔سب ٹھیک ہوتا سب اچھا ہوتا۔۔"

شازل ہر لفظ میں درد محسوس کر رہا تھا۔۔۔

یہ۔۔۔یہ کس نے لکھا ہے کہاں سے اڑ کر آیا ہے۔۔" شازل سوچ میں گم ہو گیا بار بار وہ لکھا ہوا پڑھنے لگا پھر اس نے وہ بجھا ہوا فانوس غبارہ اپنی دراز میں رکھ دیا۔رات بھر بس وہ لکھے ہوئے لفظ اور کئی سوال ذہن میں گردش کرنے لگے ۔۔۔۔اگلے دن آفس میں اس نے اپنے دوست تابش کو یہ بات بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔۔۔۔اور کہا" شازل تم بچے نہیں ہو جو کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اس آسمانی فانوس کو پکڑنے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے" ۔۔۔شازل نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔" میں نے تمھیں سب بتایا اور تم میرا ہی مذاق بنا رہے ہو میں اس آسمانی فانوس کے نہیں اس پر لکھی ہوئی باتوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں" ۔۔۔" سوری یار میں مذاق نہیں بنا رہا بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ لکھا ہو گا کسی نے اس کو اتنی اہمیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اوکے؟ ۔۔۔۔شازل نے کچھ دیر سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔۔۔پھر تابش نے اسے اچانک سے کہا۔

''شازل ۔۔۔تم نکاح کیوں نہیں کر لیتے ۔۔۔ویسے بھی تمھارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے سوائے تمھاری سدرہ آنٹی کے اور وہ بھی تم سے نفرت کرتیں ہیں" ۔شازل نے سنجیدگی سے کہا۔" ہاں صحیح کہہ رہے ہو پر میرے لیے لڑکی ڈھونڈے گا کون ۔۔آنٹی تو کبھی نہیں ڈھونڈیں گی ۔" ۔۔تب تابش نے کہا" ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے لڑکی تمھارے گھر میں ہے نہ۔۔۔۔وہ نادیہ۔۔''

یہ سنتے ہی شازل غصّے سے بھڑک اٹھا۔۔۔۔۔"تمھارا دماغ تو درست ہے۔۔کیا فضول کی بکواس بات کہہ رہے ہو وہ لڑکی پہلے ہی میرے پیچھے پڑی ہے میں سوچ رہا ہوں جلد سے جلد شادی کر لوں تا کے اس لڑکی سے میرا پیچھا چھوٹے اور تم مجھے اسی سے نکاح کرنے کو کہہ رہے ہو۔۔"

سوری بھائی میرا وہ مطلب نہیں تھا میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ اگر تم سدرہ آنٹی کے داماد بن گئے تو شاید ان کی نفرت تمھارے لیے ختم ہو جائے اور وہ نادیہ تمھارے پیچھے کیوں نہ پڑے تم ہو ہی اتنے ہینڈسم ۔" تابش نے کہا تو شازل غصّہ ضبط کر کے بولا۔" بکواس بند کرو تابش اور ہاں ان کی نفرت ختم کرنے کے لیے مجھے ان کی بیٹی سے شادی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔خیر تم سے تو رائے نہیں لینی چاہیے تھی۔۔۔"

''ارے تم تو برا مان گئے یار۔" شازل نے اس بارے میں بات نہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔۔آفس سے شام کو گھر آنے سے پہلے باہر کھانا کھا کر ہی وہ گھر آیا۔۔۔۔وہ اپنا دل بہلانے کے لیے کتاب پڑھنے لگا البتہ اس میں بھی اس کا دل نہیں تھا۔۔۔پھر وہ بالکونی میں گیا رات کے دس بج رہے تھے اور وہ دوربین سے پھر سے چاروسمت دیکھنے لگا اور اچانک سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی ۔وہ آسمانی فانوس پھر سے آسمان میں اڑتا ہوا نظر آیا۔۔" یہ کیا یہ تو کسی اور سمت جا رہا ہے۔" وہ اڑتا ہوا کہیں اور ہی جانے لگا شازل نے جھٹ سے اپنے جوتے پہنے اور گلیل لے کر برقی رفتار

سے دوڑتا ہوا گھر سے باہر آیا اور اس کا پیچھا کرنے لگا وہ فانوس پارک کی سمت جا رہا تھا اور شازل تیزی سے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا شازل نے زمین سے چھوٹا پتھر اٹھایا اور اس پر سیدھے نشانہ لگا یا زور سے وہ پتھر اس فانوس کو لگا اور اس میں پتھر سے چھید پڑ گیا اس کی آگ بجھ گئی اور وہ تیزی سے نیچے آنے لگا، شازل نے وہ فانوس جھٹ سے پکڑ لیا۔۔اس کے چہرے کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔۔۔جیسے اسے وہ چیز مل گئی ہو جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔۔۔اس فانوس پر آج بھی کچھ لکھا تھا مگر وہ اسے گھر جا کر سکون سے پڑھنا چاہتا تھا گھر آ کر وہ اپنے کرسی پر بیٹھا اور اس پر لکھا ہوا پڑھنے لگا اس پر لکھا تھا۔۔۔۔۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے امی آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں۔۔۔آپ کے ہوتے ہوئے بھی میں اس گھر میں تنہا ہوں۔۔۔۔ میں اپنے دل کی باتیں آپ سے چاہ کر بھی کیوں نہیں کر سکتی۔۔۔۔کیوں آپ مجھ سے دور ہو گئی ہیں۔۔۔کیوں میرے ساتھ انجان سی رہتی ہیں کیا ایک بیٹی اپنی ماں سے بات بھی نہیں کر سکتی۔۔۔کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ میں اپنی ماں کے ساتھ کچھ وقت گزار سکوں، اگر ابّو ہوتے تو کیا تب بھی آپ مجھے ایسے ہی نظر انداز کرتیں۔۔۔آپ نے مجھے خود سے دور کر دیا ہے امی جیسے میں کبھی آپ کی بیٹی تھی ہی نہیں۔۔"

شازل کا چہرہ مایوس ہو گیا تھا اسے اس لڑکی کے لیے برا لگنے لگا وہ جانتا تھا والدین کو کھونا کیا ہوتا ہے نہ جانے کیوں شازل کے دل میں اس لڑکی کے لیے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔۔۔اگلی رات بھی اس نے بڑی جد وجہد سے اس آسمانی فانوس کو پکڑا اور اس پر لکھا ہوا پڑھنے لگا۔۔۔اب تو اس آسمانی فانوس کو روز پکڑنا اور اس پر لکھی ہوئی باتیں پڑھنا جیسے شازل کی زندگی کا ایک اہم حصّہ ہو گیا تھا۔۔ اسے پڑھے بنا اسے نیند بھی نہیں آتی۔۔۔شازل کے اس عمل پر نادیہ کئی روز سے نظر رکھنے لگی تھی کی وہ کونسی چیز روز پڑھتا ہے جب وہ آفس گیا تب نادیہ اس کے کمرے میں آئی اور اس کے ٹیبل پر تلاشنے لگی پھر دراز میں دیکھا تو کافی سارے آسمانی فانوس دراز میں سلیقے سے فولڈ کر کے رکھے تھے وہ نکال کر اس پر لکھا ہوا سب پڑھنے لگی اور وہ لکھاوٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔۔۔"یہ تو۔۔۔یہ تو آئرہ کی لکھاوٹ لگ رہی ہے اور اس کی ہی تو امی نے اس کے ابّو کے گزرنے کے بعد دوسری شادی کی تھی۔۔۔ہاں یہ وہی ہے یہ آئرہ ہی ہے۔" وہ غصّے میں آگ بگولا ہو گئی۔۔۔۔

اور وہ فانوس فولڈ کر کے واپس رکھ دیئے اور وہاں سے چلی گئی، اگلے دن کالج میں نادیہ آئرہ کو ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔آئرہ اس کی ہی کلاس میں پڑھتی تھی وہ اسے ڈھونڈنے لگی نادیہ کو پتا تھا کہ وہ ہمیشہ کی مانند لائبریری میں ہی ہوگی۔۔۔اس لیے وہ لائبریری گئی آئرہ تنہا ایک کتاب لیے بیٹھی تھی۔۔۔اچانک نادیہ کے سامنے آتے ہی وہ چونک گئی۔۔" آپ کو کچھ چاہیے مجھ سے۔۔۔؟" وہ آہستہ سے بولی تو نادیہ بھڑک گئی۔۔۔اور کہا۔" مجھے جانتی ہو تم ؟" آئرہ نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔۔"جی۔۔۔آپ میری کلاس میٹ ہیں نہ؟ نادیہ؟۔"

''ہاں بالکل صحیح کہا تم نے آئرہ۔۔۔'' آئرہ چونک گئی۔

''آپ میرا نام جانتی ہے؟''

''ہاں جانتی ہوں اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں تمھارے متعلق۔

آئرہ پریشان سی اسے دیکھنے لگی اور بولی۔" پلیز ذرا آہستہ بات کریں لائبریری ہے سب پڑھ رہے ہیں۔

''تم مجھے مت سکھاؤ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔" لائبریری میں بیٹھے سارے لوگ اسے حیرانی سے دیکھنے لگے۔" تم روز جو وہ آسمانی فانوس پر اپنے دل کی باتیں لکھ لکھ کر اسے اڑاتی ہو، پتا بھی ہے اسے کوئی پکڑ کر روز پڑھتا ہے۔" وہ ہکا بکا ہو کر نادیہ کی باتیں سننے لگی۔" وہ میری خالہ کا لڑکا ہے جو روز تمھارے آسمانی فانوس کو پکڑتا ہے اور اسے پڑھتا ہے۔" آئرہ سرد سی رہ گئی۔" تم جو بھی کر رہی ہو اسے بند کر دو کیوں کے وہ تم سے محبت کرنے لگا ہے۔" آئرہ اس کی بات سن کر دنگ رہ گئی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔۔۔"وہ روز تمھارے اڑتے فانوس کا بے صبری سے انتظار کرتا ہے میں جانتی ہوں اس میں تمھاری کوئی غلطی نہیں ہے بس تم سے اتنا کہنا چاہتی ہوں کے تم وہ سب بند کر دو کیوں کی میرے خالہ کے بیٹے شازل سے میں نکاح کرنا چاہتی ہوں اور وہ تم سے محبت کرتا ہے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔۔۔سمجھا رہی ہوں سمجھ جاؤ ورنہ۔۔۔۔۔وہ اتنا کہہ کر وہاں سے چلی گئی، آئرہ سرد سی بیٹھی تھی نادیہ کی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگی، وہ کالج سے بھاگ کر گھر آ گئی۔نادیہ کی تمام باتیں سن کر اسے یقین نہیں ہوا کہ کوئی اس کے اڑتے فانوس کو پڑھنے کے لیے بے صبری سے اس کی راہ دیکھتا ہے کسی کو اس کی دل کی باتیں پڑھنا اتنا پسند ہے کہ وہ اس آسمانی فانوس کو کسی بھی طرح پکڑ کر لاتا ہے۔" وہ رونے لگی اور نادیہ کی باتوں کو مانتے ہوئے اس نے آسمانی فانوس پر لکھنا اور اسے اڑانا بند کر دیا۔

ادھر شازل ہر رات اس آسمانی فانوس کی راہ دیکھتا مگر ہر رات مایوس ہوتا وہ دیر رات تک اس کا انتظار کرتا۔۔۔۔دن بہ دن شازل کی اداسی بڑھنے لگی اس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا نہ اسے دل کھانے پینے میں ہوتا وہ آفس بھی جاتا تو اس کا سارا دھیان صرف اسی بات پر رہتا، اسے خود نہیں سمجھ آیا کہ

اسے ہوا کیا ہے۔تنگ آ کر اس نے تابش سے اپنے دل کا حال بیان کیا تو تابش نے اسے بتایا کہ وہ اس لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے اور شازل نے پہلی بار برا ماننے کے بجائے خاموشی اختیار کی جس سے یہ ثابت ہو گیا کے تابش سچ کہہ رہا ہے۔۔" مجھے اس لڑکی کو ڈھونڈنا ہی ہو گا تابش پتا نہیں کیا ہوا ہو گا اس کے ساتھ جو اس نے آسمانی فانوس اڑانا بند کر دیا۔۔۔ والدین کا نہ ہونا کیا ہوتا ہے میں بہت اچھے سے جانتا ہوں۔۔وہ بھی میری طرح ہی ہے بس فرق اتنا ہے کی اس کی امی اس کے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ اکیلی ہے۔۔۔میں اسے ڈھونڈوں کیسے اتنے بڑے شہر میں۔۔نہ میں اس کا نام جانتا ہوں نہ اسے کبھی دیکھا ہے۔میرے پاس صرف اس کی لکھاوٹ ہے۔"

اس کی بات پر تابش نے کہا۔۔" صرف کسی کی لکھاوٹ سے کسی کو تلاشنا ناممکن ہے شازل۔۔" شازل نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔۔۔" مجھے یقین ہے وہ مجھے ضرور ملے گی۔"

وہ گھر آیا تو نادیہ اس کی راہ دیکھ رہی تھی شاید کچھ کہنا تھا اسے مگر وہ اسے نظر انداز کر کے اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔نادیہ اس کے پیچھے آئی۔۔

''شازل۔۔۔سنو مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔''

''کیا بات کرنی ہے جلدی کہو مجھے سامان شفٹ کروانا ہے۔" ۔۔

۔۔۔" سامان۔۔۔؟ کون سا سامان شفٹ کروانا ہے کہیں جا رہے ہو۔" وہ کنفیوز ہو گئی۔

''ہاں۔۔۔کمپنی کی طرف سے مجھے ایک فلیٹ ملا ہے وہیں شفٹ ہو رہا ہوں ویسے بھی تمھاری امی خوش ہو جائیں یہ سن کر کی میں یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔۔نادیہ دنگ رہ گئی۔۔۔اور کہا۔

''شازل مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے اس سے پہلے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔۔میں۔۔۔۔۔میں اس لڑکی کو جانتی ہوں۔۔۔جس سے تم محبت کرتے ہو۔۔" شازل ہکا بکا ہو گیا۔۔۔۔۔"تم اس بارے میں کیسے جانتی ہو کیا تم میری جاسوسی کر رہی تھی۔" میں اس کا جواب بعد میں دے دوں گی۔۔۔پہلے تمھیں یہ بتا دوں کی جس لڑکی سے تم محبت کرتے ہو اس کا نام آئرہ ہے اور وہ میری کلاس میں پڑھتی ہے۔۔" شازل نے اس کا نام سنا تو کچھ لمحے یقین نہیں آیا کے اسے اس کا نام سچ میں پتا چل گیا۔۔۔" آئرہ۔" شازل کے لبوں نے دھیمے سے اس کا نام لیا اور کتنے دنوں بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔

''شازل میں تم سے معاف مانگتی ہوں میں خود غرض ہو گئی تھی صرف اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔اتنے روز سے تمھیں اداس دیکھ رہی ہوں مجھے میری غلطی کا احساس ہے۔۔۔۔محبت زبردستی کا نام نہیں ہے میں تم سے زبردستی شادی نہیں کر سکتی ایسے رشتے کا کوئی مطلب نہیں جس میں خوشی ہی نہ ہو۔۔۔۔تمھاری خوشی آئرہ میں ہے۔۔۔میں نے آئرہ سے کہا تھا کہ دوبارہ نہ آسمانی فانوس پر کچھ لکھے نہ اسے اڑائے۔۔ کیونکہ تم وہ سب پڑھ کر اس سے محبت کرنے لگے ہو اور۔۔میں ایسا نہیں چاہتی تھی تمھیں کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ پا رہی تھی۔۔۔۔مگر اتنے روز سے جب بھی تمھیں دیکھتی ہوں مایوس اور اداس ہی دیکھتی ہوں۔۔۔" شازل حیرانی سے سب سن رہا تھا۔۔۔" مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی جس دن آئرہ سے کہا کہ آسمانی فانوس اڑانہ بند کر دو اس دن سے اس نے کالج آنا بھی بند کر دیا میں اس کے گھر بھی گئی تھی۔۔" ۔۔۔۔۔"تم۔۔۔۔تم اس کا گھر جانتی ہو۔" شازل بے چین سا ہو کر بولا۔؟" نادیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔۔

''مگر وہ گھر پر نہیں تھی اس کی امی نے کہا کہ وہ اپنے نانی کے پاس رہنے گئی ہے"۔۔۔شازل خوشی سے پھولے نہ سمایا۔" تھینک یو نادیہ میں تمھارا احسان مند رہوں گا بہت بہت شکریہ۔۔۔سچ بتا کر نادیہ کو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔" وہ واپس کب آ گی کچھ پتا ہے تمھیں۔" نادیہ نے نفی میں سر ہلایا۔" مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کے وہ وہاں سے واپس آ بھی گئی یا نہیں جس طرح سے وہ اس کے گھر میں نظر انداز ہوتی آئی ہے مجھے نہیں لگتا کے وہ واپس آئے گی۔" نادیہ کے کہنے پر شازل سنجیدگی سے بولا۔" وہ مجھے ضرور مل جائے گی مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے۔"

کچھ دنوں بعد کسی ضروری کام کے سبب شازل شہر سے باہر گیا ہوا تھا کام ہوتے ہی واپسی کے وقت اس نے ٹرین پکڑی۔شام کا وقت تھا موسم بڑا سرد تھا وہ گرم جیکٹ پہنے ہوئے ٹرین میں اپنی سیٹ ڈھونڈ رہا تھا، سیٹ ڈھونڈتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا ایک جگہ آ کر رکا اسے اس کی سیٹ مل گئی تھی پر اچانک اس کی نظر اس کے سامنے والی ونڈو سیٹ پر پڑی، ایک نہایت خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی، سرخ رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے اور بادامی رنگ کی شال اپنے کاندھوں پر اوڑھے ہوئے وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔۔شازل کے غور سے دیکھنے پر اسے پتا چلا کہ وہ کھڑکی کے سمت چہرہ پھیر کر رو رہی تھی اس کے ساتھ ہی سیٹ پر اس کا کچھ سامان تھا اور کچھ فائل تھیں۔وہ اکیلی بیٹھی تھی اطراف میں کوئی نہیں تھا شازل نے معاف کر اپنا کچھ سامان سیٹ پر رکھا اور اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا شازل کے کھنکارنے پر وہ چونک کر اسے دیکھتی ہے اور آنسوں صاف کر کے پھر

کھڑکی کے سمت دیکھنے لگی۔۔۔کافی دیر تک وہ ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی، شازل اپنے موبائل پر کچھ کام کر رہا تھا۔۔کچھ دیر بعد اس لڑکی نے سیٹ پر رکھی ہوئی اپنی فائل اٹھائی اور اس کے پیپر سلیقے فائل میں رکھنے لگی تب ہی ہوا سے کچھ پیپر اڑ کر شازل کے پیروں کے پاس گرے وہ پیپر اٹھانے لگی البتہ اس میں سے ایک پیپر شازل نے اٹھایا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی وہ کوئی کالج کا اسائنمنٹ تھا اور اس پیپر پر نام لکھا تھا آئرہ فیاض اور وہ لکھاوٹ بھی آئرہ کی ہی تھی وہ لکھاوٹ وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔وہ سر دسا اسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔آئرہ نے اس کے ہاتھ میں ایک پیپر دیکھا تو ہچکچاتے ہوئے کہا۔" وہ پیپر۔۔۔۔وہ میرا ہے۔" شازل کی محویت ٹوٹی اور اس کی آنکھوں میں آنسوں آنے لگے اور وہ مسکرایا۔۔

''آئرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔تم ہی آئرہ ہو نہ؟" اس کے منہ سے اپنا نام سن کر وہ دنگ رہ گئی۔

''آپ۔۔۔۔۔میرا نام کیسے جانتے ہیں۔" شازل کی آنکھوں میں آنسوں دیکھ کر نہ جانے کیسے اس کی بھی آنکھیں نم ہونے لگی۔وہ مسکرا بھی رہا تھا اور آنکھوں سے آنسوں بھی گرنے لگے وہ جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کر کے بولا۔" تم آئرہ ہی ہو ہے نہ۔۔۔ہاں تم ہی ہو۔۔۔۔ کہاں چلی گئی تھی تم۔۔۔کیوں تم نے آسمانی فانوس پر لکھنا بند کر دیا تھا۔۔۔ وہ سن کر آئرہ ہکابکا رہ گئی اور اسے نادیہ کی باتیں یاد آئیں۔۔۔" آپ۔۔۔ نادیہ کے کزن ہیں؟؟" شازل مسکرا کر اپنی آنکھیں صاف کرتا ہے اور اثبات میں سر ہلاتا ہے۔" وہ بے انتہا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔" آئرہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے میں بھی تمھاری طرح ہی ہوں۔۔۔ایسا لگتا تھا جیسے اس آسمانی فانوس کے ذریعے تم مجھ سے بات کر رہی ہو پھر۔۔۔پھر وہ سب اچانک بند ہو گیا۔۔۔۔ایسا لگا میری زندگی سے کچھ چلا گیا ہے۔۔۔۔لیکن مجھے یقین تھا کہ تم مجھے ضرور ملوگی۔۔۔نادیہ کو اپنے کیے کا پچھتاوا تھا اس لیے اس نے مجھے سب بتایا کہ اس نے تمھیں کیا کیا کہا۔" آئرہ اس کی باتیں سن کر اپنے آنسوں ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی مگر ضبط کے باوجود اس کے بے تحاشا آنسوں گرنے لگے۔

''آئرہ۔۔۔۔میں تمھیں اپنی زندگی کا حصّہ بنانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں۔۔۔۔۔میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں آئرہ۔۔" یہ سن کر وہ شازل کی طرف دیکھنے لگی۔۔" آئرہ۔۔۔۔۔تم مجھ سے نکاح کروگی نہ؟؟" وہ کچھ دیر چپ سی تھی پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔۔۔" آپ اس بارے میں میری امی سے بات کریں تو بہتر ہوگا۔"

''اور اگر تمھاری امی نے منع کر دیا تو۔۔؟''

''تو میں آپ سے معذرت چاہوں گی۔۔" شازل مسکرایا اسے آئرہ سے ایسے ہی جواب کی امید تھی چاہے اس کی امی جیسی بھی ہو وہ اپنی ماں کے خلاف کبھی نہیں جائے گی۔۔۔" میں وعدہ کرتا ہوں تم سے تمھاری امی کو اس رشتے کے لیے ضرور راضی کراؤں گا"۔۔۔وہ اپنے وعدے کا پکّا تھا اور آئرہ خود چاہتی تھی کی وہ اپنا وعدہ نبھائے لیکن زبان سے کہنے کی ہمّت اس میں نہیں تھی۔۔۔۔وہ دونوں ٹرین کے سفر سے اپنے اپنے گھر لوٹے۔

کچھ دنوں بعد آئرہ اپنے گھر پر جلدی، جلدی کالج کے لیے تیار ہو رہی تھی۔تب ڈور بیل بجی آئرہ نے دروازہ کھولا تو سامنے شازل کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا اور کافی خوبرو لگ رہا تھا آئرہ کو دیکھ کر وہ مسکرایا اس کے ساتھ تابش کے والدین بھی تھے وہ اس کا ہاتھ مانگنے کے لیے اپنے دوست کے والدین کو ساتھ لایا تھا۔۔آئرہ نے سب کو دیکھ کر ہچکچاتے ہوئے کہا۔" السلام علیکم۔۔۔اندر آئیں۔" وہ لوگ اندر آئے اور آئرہ سیدھے اپنے ماں کے کمرے میں گئی۔پہلے تو وہ اپنے آفس جانے کے لیے جلدی میں تھی اس لیے اس کی بات سن نہیں رہی تھی مگر آئرہ نے اس سے کہا۔" کوئی آپ سے ملنے آیا ہے دو تین لوگ ہیں۔" ''اچھا ٹھیک ہے وہ جلد بازی میں ہی ڈرائینگ روم میں گئی تو انجان چہرے دیکھ کر چونک گئی۔۔۔۔پھر بیٹھ کر بات چیت کی اور اس بات چیت کے دوران آئرہ اپنے کمرے میں ہی تھی باہر نہیں آئی۔۔۔آئرہ کی امی نے ان لوگوں کے لیے چائے کافی وغیرہ بنائی اور ان سے بات کی تب اسے پتا چلا کہ وہ آئرہ کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔شازل سے ڈھیر سارے سوالات کرنے کے بعد اسے شازل آئرہ لیے بہت پسند آیا۔۔" شازل۔۔۔۔ مجھے تم آئرہ کے بہت اچھے لگے پر میں اپنے شوہر سے بھی اس بارے میں بات کروں گی وہ بھی تم سے ملیں گے۔۔اور جلد آپ لوگوں کو جواب دوں گی۔" وہ مسکرائی۔۔۔اور شازل بے صبری سے ان کے جواب کا منتظر تھا اور اللہ سے ہر دعا میں یہی مانگتا کہ آئرہ کی امی رشتے کے لیے مان جائیں۔۔۔ کچھ روز بعد شازل کی دعا قبول ہوگئی وہ بے انتہا خوش تھا کہ اس کی دعا قبول ہوگئی کیونکہ بے شک یہ دعا صرف وہ اکیلا نہیں مانگ رہا تھا۔

Nilofar Sadiya
Bolck No: 2/11, Classic Genral Store
Labour Colony,Nanded
Waghala-431602 (Maharashtra)
Mob:8855009520, 7709978280
irshad3n.n@gmail.com

کالج سے گھر آتے ہوئے آج پھر اسے دیر ہوگئی تھی۔ کالونی کا دروازہ کھولتے ہوئے نارنجی سورج کی جھلک اسے اپنی رویت کر اگئی تھی۔ مگر خوبصورت شام بھی اس کے برے موڈ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکی۔ بلکہ رہا سہا موڈ بھی اس کا جاتا رہا، جب کسی کے نظروں کا ارتکاز محسوس ہوا۔

کلثوم نے پوری کوشش کی کہ سر جھکا کے نظر انداز کر کے اپنے گھر چلتی بنے گی۔ مگر یہ کہاں ممکن تھا۔ ان گھورتی آنکھوں سے بچنا، اپنا آپ بچا کے گزر جانا اتنا آسان تھوڑے تھا۔ مکان سے چار گھر پیچھے تیزی سے قدم بڑھاتی وہ جھٹکے سے اپنا سر اپر اٹھایا اور نظر بھر کے اسی سمت دیکھا۔ جواباً آنکھوں نے ناراضگی کا اظہار واضح کیا۔ مگر کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔ اس خاتون کی نگاہیں ہنوز اسے گھورتی رہیں۔

''جانے کیا دیکھتی رہتی ہیں؟ آنکھیں تھکتی بھی نہیں۔۔'' وہ زیرلب بڑبڑاتے ہوئے بیرونی دروازہ دھکیلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ ایک تو پیدل چلنے کی خواری سے اس کا موڈ ایسے ہی بگڑ جاتا تھا اور پر سے آتے جاتے ان نظروں کا گھورنا اس کا جی جلا کر رکھ دیتا تھا۔

''یا شاید آنکھوں ہی آنکھوں سے کوئی کہانی گڑھ رہی ہو میرے خلاف۔۔'' برآمدے سے آتی اپنی ماں کو دیکھ کے اس کی چلتی زبان کو بریک لگے۔ مگر کوئی فائدہ نہیں۔ زبان پھسل چکی تھی اور چہرہ بتاتا تھا کہ وہ سن چکی ہیں۔

''نہ سلام نہ دعا۔ آتے کے ساتھ بھنبھناہٹ شروع۔۔'' شکیلہ کے ناراض لہجے پہ اس نے ذرا کان نہیں دھرا۔ شو ریک پہ اپنے جوتے سجا کے کلثوم نے پاؤں میں سلیپرز ڈالے۔ اور شانے اچکا دیے۔

'' اب آس پڑوس ایسے ویسے لوگ بسیں گے تو۔۔''

''کلثوم!'' شکیلہ نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔

وہ چلتے ہوئے ماں کے سامنے آئی۔ اور ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'' آپ مجھ پہ کیوں بھڑک رہی ہیں؟'' لہجے میں نرمی رکھی۔ ''انھیں نہیں دیکھتیں۔۔؟ آتے جاتے ہم کالونی کے لڑکیوں کو ایسے تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں گویا ہم لاکھ برائیوں کا جراثیم لے کے گھوم رہی ہیں۔''

''تم کب سے کسی غیر کی نظروں اور باتوں کا اثر کرنے لگی؟'' شکیلہ نے اس کے پونی کے بال اپنی انگلیوں سے درست کیے۔

''امی یہ روز کا ہے۔'' اب وہ دونوں ساتھ کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ ''بندہ ایک دو دفعہ نظرانداز کر بھی دے مگر یہاں تو۔۔''

''چلو اب کسی ایرے غیرے کی خاطر اپنا مزاج خراب مت کرو۔ کل سے میں یہ سب نہ سنوں۔'' وہ دونوں اندر کہیں گم ہو چکے تھے۔ باہر بس شکیلہ کی آوازیں رہ گئی تھیں۔ وہ بھی بڑبڑاہٹ کی صورت میں۔

''پہلے تو بڑی عزیز تھی تمھیں وہ پڑوسن۔۔''

ہاں۔ یہ حقیقت ہے۔

پہلے کلثوم اپنے گھر کے سامنے والی پڑوسن مسز ترنم کو خوب مانتی تھی اور جب اس ماہ رخ کالونی میں انھیں مہینہ گزرا تو معلوم چلا جمال صاحب کی وہ دوسری بیوی ہیں۔ اور تینوں بچے بھی پہلی بیوی سے تھے۔ کلثوم شدید حیران ہوئی تھی یہ بات جان کر کہ اسے کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا وہ ان کی سوتیلی ماں ہیں۔ اس دن وہ ان کی شخصیت سے مزید متاثر ہوئی تھی۔

لیکن وہ کہتے ہے نا۔۔ آئینے کے رخ میں سب واضح ہو جاتا ہے۔ سو اس پر بھی حقیقت کھلی۔

جس مسز ترنم پہ اسے افسوس ہوتا تھا کہ لوگ ان سے ٹھیک سے پیش نہیں آتے۔ عورتیں انھیں دیکھ کے نظرانداز کر جاتی ہیں۔ کوئی

ہمارے علاوہ ان سے اچھے سے بات نہیں کرتا۔ بقول لوگوں کہ اس لیے کہ ہم نئے ہیں پرانے ہونے پر خود ہی سمجھ جائیں گے۔

مگر کلثوم نے سنی سنائی باتوں پہ کان نہیں دھرے۔ وہ عموماً سلام دعا ان سے کرتی اور شکیلہ بھی خیریت دریافت کر لیتی تھی۔ لیکن پھر اس دن کے بعد سے سب بدل گیا۔ جب اس نے اپنے دونوں کانوں سے مسز ترنم کو اپنے ہی پڑوسیوں کے متعلق زہر اگلتے سنا۔ اسی لمحے اسے ادارک ہوا تھا کہ کیوں باقی لوگ ان کی صحبت سے بچتے تھے۔

مسز ترنم نے کسی کی بیٹی کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ہاتھ نچا نچا کے سب کے چال چلن گنوائے تھے۔ اس روز کے بعد سے کلثوم نے اپنی ماں کو ان سے دور رہنے کو کہہ دیا تھا۔

''ارے بیٹا۔ میں تو خود ہی اس سے کم بولتی ہوں۔ لیکن وہ راستے میں دیکھ لے تو زبردستی روک لیتی ہے۔ پڑوسی کا لحاظ کر جاتی ہوں کہ ایک ہی ساتھ ایک ہی محلے میں مل جل کے رہنا ہے۔'' شکیلہ نے وضاحتی انداز میں کہا تو وہ تڑاخ سے بولی تھی۔

''مگر مجھے تو ان کی باتوں سے پڑوسیوں کے لیے کوئی لحاظ محسوس نہیں ہوا اور مل جل کے رہنا وہ بھی سب چھوٹ جائے گا۔ بدگمانیوں کے چھینٹے سے ہم اپنا دامن نہیں بچا سکیں گے۔'' کلثوم نے بہت صاف دل سے ماں کو سمجھایا تو انھوں نے بھی سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

پھر سارے انکشاف ہوتے گئے اور آئینہ کا رخ صاف ہوتا گیا۔ بیٹی سے خاص نہیں بنتی تھیں۔ اور باقیوں سے تو چھتیس کا فاصلہ تھا۔ بچوں کے جھگڑے میں کود پڑنا۔ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دینا ہر بات انھوں نے خود ہی سے ظاہر کر دی تھی۔

آج اتوار کا دن تھا۔ وہ فرصت سے برآمدے میں بیٹھ کے اپنا نوٹس تیار کر رہی تھی۔ شکیلہ پاس والے بازار گئی تھیں۔ اس نے مشکل سے دو صفحے ابھی مکمل کیے تھے۔ جب باہر جھگڑے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے اٹھ کے جھانکنے کی نوبت گوارا نہیں کی۔ مسز ترنم کی چہکتی آواز وہ خوب پہچان گئی تھی۔

لیکن دوسرا کون تھا؟ شجرون کی ماں۔

شجرون اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ اسے اس کے لیے افسوس ہوا۔ کیوں کہ وہ مسز ترنم کی خصلت سے اتنا تو واقف ہو ہی گئی تھی۔ کہ وہ اپنی لڑائی اور بات میں کسی کو نہیں چھوڑتی تھی۔

دوپہر ہو چلی تھی۔ لیکن باہر لڑائی دیر تک چلی۔ جس میں انھوں نے ماں کے ساتھ بیٹی کو بھی نہیں بخشا۔ وہ الزام وہ باتیں سنائی جس کے نہ پیر تھے نہ کوئی سر۔ شکیلہ بھی بازار لوٹ آئیں تھیں اور کلثوم پڑھائی لکھائی بند کر کے صدمے سے بیٹھی ہوئی تھی۔

''امی۔ ترنم آنٹی نے تو حد ہی کر دی۔ وہ کسی کی بیٹی کے کردار پہ ایسے کیسے منہ پھاڑ کے بول سکتی ہیں؟'' وہ دانت بھینچ کے بول رہی تھی۔ چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ ''انھیں ذرا خدا کا خوف نہیں ہے۔ مطلب زبان ہے تو کچھ بھی بولیں گی؟ شجرون کی اماں تو بے چاری رو دینے کو ہوئیں۔'' وہ اور بھی بہت کچھ بولنے کا ارادہ رکھتی مگر شکیلہ نے اسے شانت کروا دیا۔

''شوہر آ گیا ہے اس کا وہ سنبھال لے گا سب۔ تم اپنا خون مت جلاؤ۔''

اور پھر ایک دن وہ ہوا جس کی توقع کسی نے نہیں کی تھی۔ جو دوسرے کی ماں کو اپنی بیٹی سنبھالنے کے طعنے دیا کرتی تھی۔ سب پہ نظریں جمائے رکھتی تھیں۔ وہ خود ہی سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کہاں گئی؟ کیوں گئی؟ کسی کو کوئی خبر نہیں۔ ایک دم سے مسز ترنم کا شوہر بچے چھوڑ کے چلے جانا سب کو حیران کر گیا تھا۔ پھر بعد میں شوہر نے خاموشی کا قفل توڑا تو معلوم چلا کہ انھیں کسی غیر محرم کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ جسے دیکھ شوہر کی غیرت برداشت سے باہر ہوئی۔

اور ادھر وہ گھر سے باہر۔

چند ہفتے بعد سب معمول پر آ گیا۔ سبھی اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ ایسے میں کلثوم بھی اپنے پڑھائی میں مشغول ہو گئی تھی۔ اب وہ بے فکر ہو کے کالونی کے ان گلیوں سے گزرتی تھی۔ جہاں اب کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے پس پشت کہانی بناتا۔ چونکہ وہ خود اپنی کہانی چھوڑ گئی تھی۔

وہ جو سب کو آئینے کا رخ دکھاتی بتاتی پھرتی تھیں۔ حقیقت کا آئینہ ان کا اپنا واضح رخ دنیا جہان کے سامنے لا چکا تھا۔ اس لیے کہنے والے نے کہا ہے۔ آئینے کے رخ میں کسی دوسرے کو اتارنے سے قبل اپنا رخ دیکھ لینا چاہیے۔

□□□

Nida Ahmad
Ambikapur
Surguja-497001 (Chhattisgarh)
Mob:9752232178
E-mail: nidaf9149@gmail.com

زینت فاطمہ ایس کے کبیر

بازوئے یقین

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب میں اپنی پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدرآباد اپنی خالہ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میری خالہ کا گھر جس محلے میں تھا وہ علاقہ بہت زیادہ آبادی والا تھا۔ جہاں سب مڈل کلاس سے بھی کم آمدانی والے لوگ اپنی زندگی گزر بسر کرتے تھے۔ میری خالہ کے گھر کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جس میں ایک شہناز نام کی عورت اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ شہناز کا شوہر بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی بڑھئی کی دوکان تھی۔ وہ دن بھر دوکان میں لکڑی سے سامان بناتا لیکن اس کا سامان زیادہ تر فروخت نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہاں کے امیر لوگ زیادہ تر سامان مال اور شوروم سے خریدا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کی دوکان زیادہ نہ چلتی تھی۔ کبھی کبھی کئی دن تک اس کے گھر میں فاقے ہوتے تھے۔ ایک دن شہناز کی سہیلی ریشما، اسکے گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ تب ہی شہناز کے گھر سے بچے کے رونے کی آواز سن کر وہ گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔ بچے کی رونے کی وجہ دریافت کی تو پتہ چلا کہ گھر میں دو دن سے فاقہ ہے۔ جس کی وجہ سے بچے کو دودھ کی کمی پیش آرہی ہے۔

یہ سب پریشانی دیکھ کر ریشما نے شہناز کو ایک مشورہ دیا کہ میرے بھی گھر ایسی ہی پریشانی تھی۔ لیکن میں نے اپنے شوہر کی اجازت سے ایک گھر میں مالی کا کام شروع کیا۔ جس سے میرا گھر آج خوشحال ہے، تو چاہے تو اپنے شوہر سے بات کر میں مسٹر اوبرائے کے یہاں کام کرتی ہوں وہاں ایک خانساماں کی ملازمت ہے، میں تجھے اس ملازمت کے حصول میں ضرور مدد کرونگی۔ مسٹر اوبرائے کی بیوی بڑی سمجھ دار ورحم دل ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کے وہ تجھے اس ملازمت سے ضرور نوازیں گی۔ شام کو جب شہناز کے شوہر گھر آئے تب شہناز نے اپنے شوہر کو ساری بات بتائی، اس کے شوہر نے پہلے اس ملازمت کے لیے اسے انکار کر دیا لیکن شہناز کے لاکھ سمجھانے کے بعد آخرکار شوہر مان گیا۔

صبح کے وقت ریشما اپنے کام پر جا رہی تھی، تو شہناز کو بھی اواز لگائی۔" کہ تو نے اپنے شوہر سے بات کی ہے یا نہیں" شہناز نے کہا" ہاں میں نے اپنے گھر کا کام ختم کر لیا ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ آرہی ہوں ۔میرے شوہر نے اجازت دے دی ہے۔ میں نے بچے پھو پھو کے گھر بھیج دیے ہیں" ۔شہناز اور ریشما دونوں کام پر چلے گئے۔ جب وہ مسز اوبررائے کے گھر پہنچے تو ریشما نے مسز اوبررائے کو ساری بات بتائی۔ اور مسز اوبررائے نے اسے کام پر رکھ لیا اس کی تنخوا 600 ہزار روپے ماہانہ ٹھہرائی گئی۔ شہناز نے اسے منظور کیا۔

شہناز روزانہ وقت پر اپنے کام پر جاتی اور دل لگا کر کام کرتی تھی۔ اس کا بنایا ہوا کھانا مسٹر اوبرائے کو بہت پسند آتا تھا۔ مسٹر اوبرائے کے گھر بہت سارے ملازم کام کرتے تھے۔ اور ان سب پر نظر رکھنے کے لیے مسز اوبررائے نے ایک عورت رکھی ہوئی تھی ۔جس کا نام پشپا تھا وہ شہناز کی تعریف سے بہت جلتی تھی۔ وہ ہمیشہ نظر رکھتی تھی کہ شہناز کس طرح کھانا بناتی ہے کتنی چیزیں ڈالتی ہے۔ وہ سب اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی تھی ۔اور اپنے ماما کی بیٹی کو ساری ریسپی دے دیتی تھی۔ اور کہتی تھی کہ تو بھی ایسا ہی کھانا بنانا سیکھ لے۔

شہناز کو کام کرتے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ اس کی گھریلو زندگی خوشگوار ہو گئی تھی۔ ایک دن پشپا نے مسز اوبرائے کو باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ شہناز باورچی خانے سے مصالحے، دالیں، اور دیگر سامان چراتی ہے۔ اور وہ کھانا بھی اچھے سے نہیں پکا رہی ہے۔ میری نظر میں ایک دوسری کام والی ہے جو صرف پانچ ہزار روپے تک کام کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ بات سن کر مسز اوبرائے کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا۔

اس دن شام میں شہناز صبح کام پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ لیکن اچانک موبائل فون پر میسج آیا۔ کہ تم اپنا کام ٹھیک سے نہیں کر رہی ہو اور ہم تمھیں کام سے نکال رہے ہیں۔ یہ سن کر شہناز کے چہرے سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے پہلا شک پشپا پر کیا کیونکہ وہ اس کے آگے پیچھے گھوما کرتی تھی۔ شہناز کے دل میں بہت سارے سوالات اٹھ رہے تھے۔ جو وہ

مسز اوبرائے سے پوچھنا چاہتی تھی۔لیکن وہ پھر خاموش ہوگئی۔شہناز کی آنکھوں میں میں نے وہ چمک دیکھی تھی۔جو کچھ بڑا کرنے کی تھی۔اس نے ہمت نہ ہاری اور رات بھر سوچتی رہی کہ میرے جیسی کئی عورتیں ہیں ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

رات بھر سوچ کر وہ ایک منصوبہ بناتی ہے۔کہ میں ایک کمپنی شروع کروں گی جہاں ایسی عورتوں کو کام پر لگاؤں گی جو میری طرح کام سے نکالے جاتے ہیں۔اور کام ڈھونڈتے ہیں۔وہ صبح اٹھ کر اپنے شوہر کو ساری بات بتاتی ہے۔کہ میں نے یہ منصوبہ بنایا ہے جس سے ان کا بھی فائدہ ہوگا اور ہمارا بھی۔یہ رائے اس کے شوہر کو بھی پسند آتی ہے اور صبح ناشتے کے بعد دونوں مل کر پورے محلے میں چکر لگا کر سروے کرتے ہیں کہ اگر کسی کو کام کی ضرورت ہے۔تو ہم سے آ کر ملے ہم آپ کو کام پر لگائیں گے۔

اور دوسری طرف پورے شہر میں اخبار اور اشتہار کے ذریعے یہ بات پھیلا دی کہ اگر آپ کو کوئی گھر کام والی کی ضرورت ہے۔تو آپ ہم سے رابطہ کریں اور دو سے تین دنوں میں ہی انھیں فون آنے شروع ہو گئے۔شہناز کی یہ انوٹ محنت دیکھ کر مجھے ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ اللہ پر اور اپنے بازوں پر یقین ہو تو انسان دنیا کی کوئی بھی جنگ جیت سکتا ہے۔

مسز اوبررائے نے جب سے شہناز کو نکالا تھا۔اس کے ایک دن پہلے سے ریشما نے کام سے چھٹی لی ہوئی تھی۔شہناز کے ساتھ مسز اوبرائے نے جو کیا وہ ریشما کو پتہ نہ تھا۔ریشما ایک مہینے کے بعد کام پر واپس آئی تو دیکھا کہ شہناز نے کام چھوڑ دیا ہے۔اور شہناز کی جگہ ایک نئی خانساماں کو لگایا گیا ہے۔نئی خانسامہ کا بنایا ہوا کھانا مسٹر اوبررائے کو پسند نہیں آتا تھا۔اور پشپا کے غلط برتاؤ کی وجہ سے سارے ملازم دھیرے دھیرے کام چھوڑ کر جا رہے تھے۔

ریشما کو دیکھ کر مسز اوبررائے کو بہت خوشی ہوئی۔اور مسز اوبرائے نے ریشما سے کہا" کہ تمہاری سہیلی کام چھوڑ کر چلی گئی ہے۔تم اس سے کہو کہ وہ کام پر واپس آ جائے"۔ریشما کہتی ہے ٹھیک ہے میں شہناز کے گھر جاتی ہوں اور اس سے بات کر کے دیکھتی ہوں کہ اس نے اتنا اچھا کام کیوں چھوڑا۔اور ریشما اپنے کام پر لگ جاتی ہے۔تب ہی ریشما کے پاس مسٹر اوبرائے کے گھر کے دربان راموکاکا آتے ہیں۔اور کہتے ہیں " کہ ریشما تمہاری سہلی شہناز نے کام چھوڑا نہیں ہے۔پشپا نے اسے کام سے نکال دیا تھا۔اور شہناز کی جگہ اپنے ماما کی لڑکی کو کم پیسوں میں کام پر لگایا تھا"۔ریشما شام کو شہناز کے گھر جاتی ہے۔اور اس کو ساری بات بتاتی ہے۔تب شہناز کا شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ مجھے نکالنے کے پیچھے پشپا کا ہی ہاتھ تھا۔

ریشما کہتی ہے" کہ مسز اوبرائے نے تجھے پھر سے کام پر بلایا ہے تو کل سے کام پر واپس آ جا"۔شہناز کہتی ہیں" مسز اوبرائے بہت مطلبی عورت ہے اب میں واپس کام پر نہیں آؤنگی۔مجھے دوسرے گھر کام مل گیا ہے ایسا مسز اوبرائے کو بول دو"۔میں نے ایک کمپنی کھولی ہے کام دلانے کی اگر تجھے کبھی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔

ریشما صبح کام پر جاتی ہے اور مسز اوبررائے سے کہتی ہے" کہ شہناز اب کام پر نہیں آنے والی ہے۔اس کو دوسرے گھر میں کام مل چکا ہے"۔اتنا کہہ کر ریشما اپنے کام پر لگ جاتی ہے یہ بات سن کر مسز اوبرائے بہت بڑی پریشانی میں آ جاتی ہے کہ اب میں کہاں سے ملازم لاؤں اگر میں نے پشپا کی بات نہ مانی ہوتی تو آج میرے گھر پہلے جیسے کئی ملازم ہوتے۔اب میں کیا کروں وہ ہال میں صوفے پر بیٹھے ہوئے سوچتی ہے۔ایک دم سے اس کی نظر اخبار کے اس اشتہار پر پڑتی ہیں۔جس میں لکھا تھا اگر آپ کو گھر کام والی کی ضرورت ہے تو ہم سے رابطہ کریں وہ فوراً فون اٹھاتی ہے اور اس اشتہار والے نمبر پر فون لگاتی ہے۔

وہ فون شہناز کے شوہر اٹھاتے ہیں۔اسے اسپیکر پر رکھتے ہیں۔سامنے سے مسز اوبرائے کہتی ہیں ۔" کہ ہمارے گھر کام والی کی ضرورت ہے ہمارا ایڈریس نوٹ کیجئے"۔مسز اوبررائے کی آواز سن کر شہناز اپنے شوہر کو جواب دینے سے روک دیتی ہے۔اور خود ہی کہتی ہے" مسز اوبررائے آپ کے گھر کام کرنے کے لیے کوئی ملازم بچا ہی نہیں ہے۔آپ ایک مطلبی عورت ہیں آپ کے یہاں کام کرنے کے لیے ہمارے یہاں ملازم نہیں ہے۔آپ اپنا سارا کام پشپا اور اس کی بہن سے ہی کروایئے"۔شہناز کی آواز سن کر مسز اوبرائے کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئی تھی۔مسز اوبرائے سوچتی ہیں کہ شہناز کو میں نے کام سے نکالا لیکن اوپر والے نے اسے اتنا بڑی روزی کا ذریعہ دے دیا۔اس کی محنت کام آئی اور میں لالچ کے اندھے جال میں پھنس کر رہ گئی۔

آج میں دو سال بعد اپنے خالی کے گھر گئی۔تو دیکھا کہ شہناز کا وہ چھوٹا سا گھر ایک دفتر میں تبدیل ہو چکا ہے۔سچ میں اس کی محنت رنگ لائی شہناز کا بازوئے یقین بہت مضبوط تھا۔

Zeenat fatema SK. Kabir
Address: Zam Zam Colony Parwa Get
Dargah Road Parbhani.431401 (M.S)
Mob: 9689504144
zeenatfatema874gmail.com

زرینہ عبدالسلیم

شکوہ اور شکر

خواہشات انسان کو لاحاصل کی شکایتوں کی طرف راغب کرتی ہیں اور جو حاصل ہو اس کے شکر سے دور کر دیتی ہیں۔ ماریہ زندگی بھر خوابوں میں جیتی رہی۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی گئی اس کی خواہشوں کا سلسلہ اور بھی بڑھتا گیا۔ جو پاس تھا اس سے مطمئن نہ تھی اور جو پاس نہیں تھا اس کی آرزو میں وقت برباد کرتی رہی۔ اپنی ہی دنیا میں الجھی رہتی۔ اب تو شوہر- راشد بھی اس کی روزانہ کی شکایتوں سے پریشان ہو کر اس سے دور رہنے لگا۔ دنیا کی فانی چیزوں کی طلب میں وہ ایسی کھوئی کہ کب ماضی گزر گیا اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ بچے دھیرے دھیرے بڑے ہو گئے یہی سنتے سنتے کہ ہمارے گھر میں یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے، فریج اچھا نہیں ہے، اے سی کوئی کام کا نہیں ہے، چھوٹے کمرے ہیں، اور دو تین کمرے چاہیے تھا، اتنے پیسوں میں یہ نہیں ہوتا، وہ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ بیٹے-ساحل نے بھی اپنی امّی کی ان باتوں کا خوب فائدہ اٹھایا اور انجینئرنگ کے پہلے سال میں دوسری دفعہ فیل ہونے پر یہی بہانا بنایا کہ پڑھائی کے لیے گھر کا ماحول ہی ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ علحدٰہ روم چاہیے، لیپ ٹاپ چاہیے۔ یہ ٹیوشن اچھی نہیں تھی۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔ ماریہ کو ساحل کا بگڑتا مستقبل نظر تو آ رہا تھا لیکن اسکی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کیونکہ اسے تو دنیا کی ہر نعمت میں کمی ہی نظر آتی تھی۔ ساحل کے بہانے بھی اسے جائز لگنے لگے۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے انتظار نے ماریہ کو تھوڑا جلد ہی بوڑھا کر دیا تھا اب وہ پینتالیس (45) کی عمر پار کر چکی تھی۔ ایک روز اس کی سہیلی زینب اس سے ملنے آئی جو ماریہ سے ایک عرصہ کے بعد اچانک کسی کی شادی کے موقعہ پر مل گئی تھی اور اکثر ماریہ کے اسرار پر ملنے آ جایا کرتی تھی۔۔ کئی دنوں سے ماریہ گم سم سی تھی۔ جیسے اندر ہی اندر گھل رہی ہو۔۔ زینب جو بہت خوش مزاج تھی اسے خوب ہنسایا کرتی تھی۔ زینب سے مل کر جیسے ماریہ کے کچھ غم کم ہو جاتے۔ دونوں نے مل کر ناشتہ کیا چائے پی پرانی باتوں کو یاد کر کے خوب قہقہے لگائے۔ پھر اچانک زینب بول بیٹھی۔

ہوئی نہ بات-----آج نظر آئی وہ پہلے والی ماریہ جو ہنسا ہنسا کر سب کے ناک میں دم کر دیتی تھی۔ سچ میں ماریہ۔ تم سے تو کالج کی رونق تھی-- ہم نے ساتھ میں زندگی کے وہ سب سے سنہرے لمحات گزارے۔ لیکن اب تم کو دیکھ کر ایسا کیوں لگتا ہے جیسے تم کئی سالوں سے مسکرانا بھول گئی ہو؟ کم از کم مجھے تو بتا سکتی ہو۔ دیکھو آج میرے ساتھ یوں قہقہے لگا رہی تھی تو تم کتنی اچھی لگ رہی تھی"۔

ماریہ کچھ دیر نیچے نظریں کر کے زینب کی بات سنتی رہیں اور پھر دھیمے لہجے میں اس کا جواب دیا

ہاں سچ میں۔۔ آج بہت دنوں بعد کھل کر ہنسی ہوں میں--- انسان جو چاہتا ہے زندگی میں۔ ضروری نہیں اسے وہ سب مل جائے۔۔ میں نے بہت خواب دیکھے تھے۔ بہت ارمان تھے میرے لیکن شادی کے بعد ان میں سے ایک خواب بھی پورا نہ ہوا--تمھیں یاد ہے؟ میں کیا کہا کرتی تھی--کہ میں شادی کے بعد یہاں جاؤنگی وہاں جاؤنگی--- اتنے کپڑے خریدونگی--اتنی شاپنگ کرونگی۔۔ میرا گھر اتنا بڑا ہوگا--اپنے گھر کو ایسا سجاؤنگی۔ یہ یہاں رکھونگی وہ وہاں رکھونگی --- سب ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے"۔

زینب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا"ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟۔۔ راشد بھائی تمھیں خوش نہیں رکھتے کیا؟ تمھارا گھر تو اتنا اچھا ہے۔ اور ماشاء اللہ تمہارے بچے کتنے پیارے ہیں۔ کس چیز کی کمی ہے تمھیں؟"

ماریہ نے لمبی سانس لی اور کہنے لگی۔
ہاں۔ سب کو ایسا ہی لگتا ہے۔۔۔۔تم ہی بتاؤ؟۔۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے- یہ بھی کوئی گھر ہے-- ایک چھوٹا سا ہال اور دو روم، کچن میں ٹھیک سے ہوا بھی نہیں آتی،۔ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ کم از کم انھیں علحدہ روم تو چاہیے نہ پڑھائی کرنے کے لیے؟ اس سال صرف تین یا چار جوڑے ذرا مہنگے خریدے بس۔۔ باقی سب ایسے ہی۔۔ اور گھومنے پھرنے کی تو بات ہی مت کرو۔ ایک بار کہیں شہر سے باہر گھوم آئے تو دو سال کی فرصت۔ پھر پتہ نہیں، کب وقت ملے گا ان کو۔ میں نے تو سوچا تھا۔ ہر سال ملک کے الگ الگ سیاحتی مقام پر گھومنے جاؤں گی ان کے ساتھ۔ بچے نئے نئے فیشن کے کپڑے پہنیں گے۔ خوب فلمیں دیکھیں گے۔ زندگی کے مزے لینگے۔ لیکن راشد۔ انہیں یہ سب پسند ہی نہیں"۔
زینب سر ہلا کر ہلکی سی مسکرائی اور پوچھا--"محبت تو کرتے ہیں نہ؟"
"محبت ہاں محبت تو کرتے ہیں۔۔ پر کیا کروں میں ایسی محبت کا۔ جو خوشی ہی نہ دے۔"
زینب نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔۔۔۔ جسے دیکھ کر ماریہ کو حیرت ہوئی کہنے لگی۔"زینب!-کیا ہوا۔۔ میری داستان اتنی بھی بری نہیں تھی جو تم اتنی پریشان ہوگئی۔۔ ارے مجھے تو اب عادت سی ہوگئی ہے بی اب ایسے ہی زندگی گزر جائے گی ارمان دل کے دل میں ہی رہ جائیں گے۔۔ مجھے اتنا پتہ ہے کہ میں کبھی زندگی میں خوش نہیں رہ سکتی اب۔ میرا خون یوں ہی جلتا رہے گا۔ اب تو صبر کر لیا میں نے"۔
زینب نے فوراً نہیں میں سر ہلا کر ماریہ کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہا۔۔
"ماریہ! میں تمھارے لیے افسردہ نہیں ہوں بلکہ افسوس ہے مجھے تمھاری سوچ پر----بس یہی وجہ تھی تمہاری خاموشی اور اداسی کی؟ یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے تم نے خود کو تنہا کر دیا؟ شوہر کی محبت کھودی؟ خوش رہنا بھول گئی۔ ہنسنا بھول گئی؟"۔۔۔
"تم چلو میرے ساتھ"۔
"کہاں؟"
"تم چلو تو سہی۔"
"ارے لیکن کہاں؟ کیا ہوا کچھ بتاؤ تو"--
"ماریہ! میں نے تم سے تمھارا حال پوچھا اور جب بھی پوچھا تم نے اپنے رونے مجھے سنائے لیکن کیا میں نے کبھی اپنے بارے میں تمہیں کچھ ایسا بتایا کہ مجھے زندگی سے شکایت ہو؟۔۔۔ اور میں نے کبھی بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کیوں کہ میں ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتی ہوں اور مجھے زندگی سے کبھی کوئی شکایت ہی نہیں رہی۔ آج تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں تمھیں حقیقت بتاؤں"۔
"کیا بات ہے زینب بتاؤ"۔۔۔
"تم چلو میرے ساتھ میرے گھر۔ تم آج تک نہیں آئیں"۔۔۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے کپڑے تو بدلنے دو۔ یہ اچھے کپڑے نہیں ہیں۔ اور پرس بھی لیکر آتی ہوں"۔
زینب ماریہ کو اپنے گھر لے گئی۔ جو ماریہ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ ماریہ کو اپنے غموں اور اپنی تکلیفوں سے فرصت کہاں تھی کہ وہ کسی کا حال جانتی۔ اپنے خوابوں کو یاد کرتی اور ان کے پورے نہ ہونے پر افسوس کرتی۔ آج جب وہ زینب کے گھر کے باہر رکی تو جیسے اچانک برسوں کی نیند کے بعد جاگ سی گئی اور اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔ ایک کچی دیواروں والا مکان۔ جس پر ٹین کا چھت ہے۔ جو دوپہر کی کڑک دھوپ کی وجہ سے شعلے برسا رہا ہے۔ گھر کے سامنے اتنی بھی جگہ نہیں ہے کہ ماریہ کی گاڑی وہاں کھڑی کی جاسکے۔ اندر جا کر دیکھا تو ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ ایک چارپائی۔ ایک میز اور کرسی۔ ایک الماری کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اندر دوسرا کمرہ ہے جسے وہ کچن کہتی ہے۔ ایک پانی کا مٹکہ، کچھ برتن اور گیس سلنڈر جو کہ نیچے ہی رکھا ہوا ہے۔ ماریہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ وہ بول بیٹھی۔
"یہ سب کیا ہے زینب! یہ تمھارا گھر ہے؟ یہاں کیسے رہ سکتی ہو تم۔ تمہاری باتوں سے کبھی بھی محسوس نہیں ہوا کہ تم اس حال میں رہتی ہو۔ تم تو ہمیشہ خوش رہتی ہو اور دوسروں کو بھی خوش کر دیتی ہو اپنی خوش مزاجی سے۔۔۔ تمھارا گھر دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی۔
تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔ اور بیٹا؟ وہ کیسے رہتا ہے یہاں؟
"ہاں ماریہ- یہ میرا گھر ہے۔ لیکن میں اس میں بہت خوش ہوں کیوں کہ میں ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔۔ میں نے اپنی اولاد کو بھی یہی سکھایا۔ اور اپنے شوہر سے صرف ایک ہی امید رکھی کہ وہ مجھے محبت کریں اور ہر قدم پہ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ میری شادی کے وقت انکا بزنس اچھا چل رہا تھا لیکن کووڈ کے بعد سب کچھ کھو دیا ہم نے۔ شکر ہے کہ ہم نے اپنے بیٹے کو ہر حال میں خوش رہنے کی ترغیب دی۔ دھیرے دھیرے اس حال سے بھی نکل جائینگے انشااللہ۔ ہم جو بھی کماتے ہیں اس سے ہمارا گزارا ہو جاتا ہے۔ ان کی پرائیوٹ نوکری ہے۔ تنخواہ کم ہے۔ لیکن ان کی تنخواہ سے گھر چل جاتا ہے-۔ میں شام کو ٹیوشن

پڑھاتی ہوں۔ اور ان پیسوں کو بچوں کی تعلیم پر خرچ کرتی ہوں۔ میرے بچے کو پڑھنے کے لیے کوئی علیحدہ کمرہ نہیں ہے صرف یہ ایک میز ہے اس کی پڑھائی کے لیے۔ اور یہ ایک لیمپ جو میں نے اسے تحفہ میں دیا تا کہ وہ رات کو بھی پڑھ سکے---- اگر میں بھی تمھاری طرح افسوس بھری زندگی گزارتی تو آج شاید زندہ ہی نہیں رہتی لیکن میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔ میں نے صرف خدا کا شکر کیا اور صبر کیا۔ اس لیے میں ہمیشہ خوش رہتی ہوں۔ اور تم نے۔۔۔۔ تم نے شکوے کیے۔ اس لیے تم ہمیشہ افسردہ رہتی ہو"۔

باہر سے آواز آنے لگی

''امّی-- آمّی-------- آمّی کہاں ہیں آپ؟"

''میرا بیٹا یوسف آ گیا۔۔۔۔۔"

''یوسف یہ ماریہ آنٹی ہیں۔ میری دوست"۔

''اسلام وعلیکم آنٹی۔۔۔۔"

یوسف خوشی سے جھومتا ہوا اپنی امّی سے مخاطب ہوئی

''امّی! ہم نے آپ کو بتایا تھا نا کہ کالج میں پچھلے مہینے کمپنی سے سلیکشن کے لیے انٹرویو ہوئے تھے۔۔ آج اس کا رزلٹ تھا"۔

''ہاں بیٹا۔۔۔ میں نے تہجد میں دعا کی ہے۔۔۔ انشااللہ اچھا رزلٹ ہوگا"۔۔

''اچھا نہیں۔۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔۔ امّی۔۔۔ مجھے بہت بڑی کمپنی میں جاب مل گئی۔۔۔ ہماری محنت، صبر اور آپکی دعا رنگ لائی امّی۔۔۔ امید سے زیادہ حاصل کر لیا ہم نے۔۔۔۔ ہمارے دن پلٹ گئے اب امّی۔۔۔ یہ سب آپکی محنت اور تربیت کا نتیجہ ہے"۔۔۔

یوسف اپنی امّی سے لپٹ گیا۔۔۔ اور اس کی آنکھیں نم ہو گیا۔۔۔ زینب کے وہ سارے آنسو جو اس نے سالوں سے چھپا کے رکھے تھے ایک ساتھ باہر امڑ پڑے۔

ماریہ یہ سب دیکھتی ہی رہ گئی۔۔۔۔

''الحمد اللہ بیٹا۔۔۔ شکرانہ ادا کرو اور جاؤ اپنے ابّو کو یہ خوش خبری دے دو جلدی سے"۔۔۔

''جی امّی۔۔۔ میں ابھی آیا"۔

ماریہ نے جھٹ سے زینب کو گلے سے لگا لیا۔"مبارک ہو زینب"

''ماریہ۔ میرے بیٹے نے بہت محنت کی۔ دیکھو ہمارے صبر کا پھل ہمیں مل گیا۔ سوچو اگر میں محنت کرنے کی بجائے،۔۔۔ بچے کی تعلیم کی طرف دھیان دینے کی بجائے۔۔۔ دنیاوی دکھاوے کی چیزوں کے پیچھے بھاگتی رہتی۔۔۔ تو کیا آج یہ کامیابی نصیب ہوتی؟ ہمیں ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔۔۔ اور زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔۔۔۔۔ یہی اچھی زندگی گزارنے کا فلسفہ ہے"۔

''ماریہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے زینب سے کہا۔''سچ میں زینب۔۔۔ کتنی بے وقوف تھی میں۔۔ آج تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ سب کچھ تو تھا میرے پاس اتنی محبت کرنے والا شوہر۔ اتنا بڑا گھر۔۔ گاڑی۔۔ کھانا پینا - عیش و آرام -- اور میں صرف شکوہ کرتی رہی۔۔ شکوہ، شکوہ اور صرف شکوہ۔۔۔۔ اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو میں نے شکوہ شکایت میں گزار دیئے۔ آج سمجھ میں آیا کہ انسان کے پاس جو ہو اس میں وہ خوش رہ سکتا ہے۔۔ محنت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ اور کامیابی محنت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ میں نے کبھی تمہارے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔ اور تمھارا چہرہ ہمیشہ خوشی کے نور سے چمکتا رہا۔۔-- اور میں۔۔۔ اور میں اندر ہی اندر اپنے خون کو جلاتی رہی"۔۔

'کتنی بے وقوف ہوں میں'۔

اور تب ماریہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔۔ زینب نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے سمجھایا۔

''ماریہ۔ میں نے صرف اسی لیے تمہیں اپنے گھر بلایا تھا۔۔ تا کہ تمھیں سمجھ میں آجائے کہ دنیا کی بے جا خواہشات اور ناشکری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے افسوس اور غم کے۔۔۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔۔۔۔ جاؤ۔ اب ایک الگ نظریہ سے دنیا کو دیکھنا شروع کرو۔۔ یہ دیکھو کہ ہمارے پاس کیا ہے۔

شوہر کی محبت کی قدر کرو بچوں کو بھی شکر گزار بناؤ اور امید مت ہارو۔۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔۔۔ دیکھنا تم ہمیشہ خوش رہو گی"۔۔--

''ہاں زینب۔۔۔۔ تم نے مجھے بدل دیا۔ میری آنکھیں کھول دیں۔ آج مجھے اپنی زندگی کے سارے غم اتنے معمولی محسوس ہو رہے ہیں کہ میں فضول ہی اتنا سوچتی تھی۔ سچ میں بے وقوف ہوں ہیں"۔

''ہاں! وہ تو تم ہو ہی۔۔"

زینب اور ماریہ دونوں خوب زور زور سے ہنسنے لگے۔

Mrs. Zarina Abdul Salim
1800 Eroz Society,
Om Nagar, Koradi Road,
Nagpur-440030 (M.S)
Mob: 9322444311
alimzarina22gmail.com

غزلیں

جوہی عشرت

غور سے دیکھ تو زندگی میں ہے کیا
دل میں سوزش نہیں بندگی میں ہے کیا

گرچہ کامل یقیں ہو خدا پر ترا
بت کدے سے یوں ہی دل لگی میں ہے کیا

کیا گزرتی ہے دل پہ مرے کیا کہوں
خوش ہوں کافی میں رنجیدگی میں ہے کیا

خواب ٹوٹا مگر دوسرا بس گیا
ان ستاروں کی سی نغمگی میں ہے کیا

وقت کے ساتھ جوہی تو بھی خود بدل
اب زمانے کی اس سادگی میں ہے کیا

Joohi Ishrat
Research Scholar
(Ranchi university Ranchi)
At+Post. Kalyanpur
PS+Dist. Garhwa-822114 (Jharkhand)
Mob: 7061615009
Email: ishartjoohi@gmail.com

انعم جویریہ

ہمارے حق میں بتاؤ حبیب کیا کرتے
تمام لوگ تھے اپنے رقیب کیا کرتے

محبتوں کے زمانے میں ہم کبھی اُن کے
قریب ہو کے نہیں تھے قریب کیا کرتے

تھی آزمائشیں اس دور میں کڑی یارو!
نہیں تھا کوئی بھی ہم سا غریب ، کیا کرتے

ضرورتوں پہ، قلم کو بنالی تلواریں
اب ایسے دور میں شعراء، ادیب کیا کرتے

کمان علم کی، بے علم کو عطا کردی
عجیب لوگ وہ اس سے عجیب کیا کرتے

دوا جو کام نہ آئی تو پھر خدا کے حضور
دعا نہ کرتے تو آخر طبیب کیا کرتے

انہیں تو خار کے بدلے ملے ہیں پھول انعم
بلندیوں پہ ہیں اُن کے نصیب کیا کرتے

Anam Javeriya
Sayyed Kaleem, Shikshak Colony,
Amdapur, Dist. Buldana-444301 (M.S)
kaleemrahbar1976@gmail.com

شاہینہ پروین

بن موسم برسات اور میں

یوں تو مجھے
سارے ہی موسم پسند ہیں
لیکن
بن موسم کے برسات مجھے بہت پسند ہے
وہ بھی تب
جب میں گھر پر رہوں
اور میرے ہاتھ میں
چائے کی پیالی ہو
تنہا خاموش کھڑکی کے قریب
بارش کا دلکش منظر دیکھوں
گلی محلے کے بچوں کو
خوشی سے اچھلتا دیکھوں
ایک دوسرے پر
بارش کے چھینٹے اُڑاتا دیکھوں
کاغذ کی کشتی بہا کر
خوشی سے سرشار چہرے
اور شاخِ گل کو جھومتا دیکھوں
اور پرندوں کا
اپنے بچوں کو پروں میں چھپانا
دریاوں ندیوں اور تالابوں میں
مچھلیوں کو خوشی سے مچلتا دیکھوں
تو ایسے میں میرے دل کو
ایک الگ ہی سُرور ملتا ہے
میرے چہرے پر
ایک الگ ہی تازگی کا احساس ہوتا ہے
اور میری زبان
بے ساختہ حسب عادت کہہ اٹھتی ہے
فبای آلاء ربکما تکذبان

Shahina Parween
Research Scholar
Momin Mohallah,No:6
Jamuria by Pass road
PO/PS: Jamuria
Dist:Paschim Burdhman-713336 (W.B)
Mob No:8348210150
Email Id:shahinajamuria@gmail.Com

ڈاکٹر ابو طالب انصاری

خوبصورتی کا راز: کاسمیٹک پروڈکٹس

سجنا سنورنا، پرکشش اور جاذب نظر آنا انسانی فطرت ہے خاص طور پر صنف نازک کی۔ زمانہ قدیم میں جب انسانی زندگی سادہ تھی تب بھی یہ جذبہ تھا، اس وقت قدرتی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ مگر جیسے جیسے ترقی ہوتی گئی تب اس جذبہ کی تسکین کے لیے بیوٹی پارلر، اسپا وغیرہ نے اپنی خد مات پیش کیں۔ میک اپ کے لیے کاسمیٹک پروڈکٹس ایجاد ہوئے۔ جلد ہی اس نے مارکیٹ کے رخ کو بدل دیا اور تجارت کی شکل اختیار کرلی۔ ناخن، بالوں اور آنکھوں کی آرائش، دانت، چہرہ، ہونٹوں کو رنگنا اور تراش خراش کر حسین بنانے کیلیے پاؤڈر، کریم، لپ اسٹک، سیرم، صابن، شیمپو موائسچرائزر، ڈی اوڈورنٹ، کنڈیشنر، کولوگینس، پرفیوم، بالوں کی ڈائی اور ڈینٹل پروڈکٹس وغیرہ ایجاد ہوئے۔ کاسمیٹک کے استعمال کی باقاعدہ تاریخ مصریوں کے یہاں ملتی ہے۔ مصریوں کے یہاں بالوں اور چہرے کی آرائش، سرمے، کاجل اور لائنر وغیرہ استعمال کئے جاتے تھے۔ چہرے پر سرخی لانے کے لیے غازہ کے طور پر پھولوں کی پنکھڑیوں کے پاؤڈر استعمال کئے جاتے تھے۔ خوشبو، خوشبودار تیل اور سن اسکرینگ ایجنٹ کے علاوہ رنگ گورا کرنے کے لیے لیڈ سے بنے نسخے استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کے بعد یونان، چین جاپان، منگولیا میں بھی کاسمیٹک پروڈکٹس تیزی سے استعمال کیے جانے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ جدید کاسمیٹک کے تانے بانے یورپ سے ملتے ہیں۔ یہاں اس کی باقاعدہ انڈسٹری قائم کی گئی اور 21 ویں صدی آتے آتے پوری دنیا میں کاسمیٹک پروڈکٹس استعمال کئے جانے لگے۔ اس میں ایشیاء تیزی سے استعمال کیا جانے والا براعظم بن گیا۔ پہلا کاسمیٹک برانڈ Shiseido نے بنایا یہ فارماسیوٹیکل کمپنی تھی۔ اس نے جلد کو خوبصورت اور ملائم بنانے کیلیے 1897 میں Eudermine نامی پروڈکٹ بنایا۔ اس کے بعد ''پونڈس'' آیا جس نے کاسمیٹک مارکیٹ میں دھوم مچا دی۔ جسمانی تراش خراش اور ان کی تبدیلی بھی ''ایستھیٹک'' کا حصہ ہے۔ چونکہ شیمپو، پاؤڈر اور اینٹی ایجنگ پروڈکٹس زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں اس لیے ہم ذیل میں انہیں کے تعلق سے بات کریں گے۔

شیمپو (Shampoo)

یہ ہندی زبان کے لفظ campo سے ماخوذ ہے۔ Shampoo مخفف ہے Simulated Hydrophilic Artificial Material

Obstruction Providing Oil کا۔ یہ بالوں کوصاف کرنے کے علاوہ ڈینڈرف اور جوئیں دورکرنے کیلیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ 1903 میں جرمنی (برلن) کیمسٹ ''ہینس شواز کوف'' نے پہلا شیمپو بنایا۔ شروع میں یہ بنفشی رنگ کا پاؤڈرتھا۔ بعدمیں بوتل میں دستیاب ہونے لگا۔شیمپومیں عام طور پرسوڈیم لاورل سارکوسنیٹ (Sodium lauryl sarcosinate)،سوڈیم لاورل سلفیٹ(sodium lauryl sulfate)،سوڈیم لاوریتھ سلفیٹ(sodium laureth sulfate)، کوکامڈوپروپل بٹین (cocamidopropyl betaine) ہوتے ہیں۔کنڈیشنر اورشیمپو دونوں مختلف چیزیں ہیں۔کنڈیشنر شیمپوکے بعد استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ بالوں کوصحت مندر کھتے ہیں اورچیچپاہٹ کودور کرتے ہیں۔

شیمپوکی اقسام(**Types of shampoo**):

ریگولرشیمپو(Regular shampoo): اسے کوئی بھی استعمال کرسکتا ہے۔یہ کسی مخصوص بیماری کے لیےنہیں ہے۔

ایوری ڈے شیمپو(Everyday shampoo): یہ سوپ (صابن)اورالکلی فری ہوتاہےاوراسے اس طرح سے تیارکیا جاتا ہے کہ سر(بالوں) کوصاف کرے۔ یہ ڈینڈرف اور کھجلی (چنبل) وغیرہ کیلیے مفیدہے۔ بالوں کوچمکدار بناتا ہے۔ Sebamed every day shampoo بہترین ہے۔

کلیری فائنگ شیمپو(Clarifying shampoo): یہ صفائی کے لیے ہے جوتیل،گندگی اوردیگرغلاظت کوسراوبالوں جڑ وں سے صاف کرتا ہے۔اس کا PHدوسرے شیمپوسے زیادہ ہوتا ہے۔ Ash:ba shampooبہت ہی بہتر ہے۔

اینٹی بریکیج شیمپو(Anti-breakage shampoo): بالوں کی جڑوں کومضبوط بناتا ہے۔دومنہ کے بالوں کوبھی ٹھیک کرتا ہے۔ Nioxin System 1 Shampooبہترین ہے۔

پیوری فائنگ شیمپو(Purifyingshampoo): یہ صفائی کے لیے ہے جوتیل، گندگی اوردیگرغلاظت کوبالوں کی جڑوں سے صاف کرتا ہے۔اس کا PHدوسرے شیمپوسے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ زیادہ کنسنٹر یٹیڈ ہے۔Bioderma node G purifying shamooبہترین ہے۔

ڈرائی شیمپو(Dry shampoo): کبھی کبھی استعمال کیلیے یہ بہتر ہے کیونکہ یہ بالوں کوصفائی سے زیادہ تازگی دیتا ہے۔ یہ تیل اورچکناہٹ کو جذب کرتا ہے لھذا روغنی جلد والوں کے لیے بہتر ہے۔ Dove dry shampooبہترین ہے۔

موائسچرائزنگ شیمپو(Moisturizing shampoo): اس قسم کے شیمپومیں زیادہ گیلا پن ہوتاہےجس سے بالوں کی صفائی میں مددملتی ہے اوردھوتے وقت قدرتی نمی باقی رہتی ہے۔ یہ بالوں کے گچھ کوکم کرتے ہیں جس سے بال ٹوٹتے نہیں ہیں۔ یہ روکھے بالوں کے لیے بہترین ہیں۔ TRESemmé Rich Moisture Shampoo & Conditioner systemاور Plum & argan frizz avacadoبہترین ہیں۔

ولومنائزنگ شیمپو(**Volumizing shampoo**):اس قسم کے شیمپوکےاستعمال سے بال بھرے ہوئےنظرآتے ہیں۔جنکے بال چپٹے اورچپکے ہوں ان کے لیےمفید ہے۔ Kiehl's Rice and Wheat Volumizing Shampoo.بہترین ہے۔

شیمپوکاانتخاب:

- بالوں میں روغن زیادہ ہواور limp hair ہوں تو volumizing shampooاور Clarifying shampoos استعمال کرنا چاہیے۔
- بال روکھے ہوں تو moisturizing shampoo or sulfate-free shampooاستعمال کرناچاہیے۔
- موٹے ،گھنگھرالے اورروکھے بالوں کے لیے Hydrating and moisturizing shampooاستعمال کرنا چاہیے۔

- بہترین شیمپو وہ ہے جو آئل، گندگی دور کرے اور بالوں کو بھر بھرا اور چمکدار بنائے۔
- اگر بالوں میں روغن زیادہ ہو تو ہفتے میں تین بار شیمپو کرنا کافی ہے۔
- موٹے، مڑے ہوئے اور روکھے بالوں کے لیے ہفتہ میں ایک بار شیمپو کرنا کافی ہے۔
- بیکنگ سوڈا بالوں کو صاف کرتا ہے جبکہ سیب کا سرکہ PH کو برقرار رکھتا ہے اس سے بال صحت مند رہتے ہیں۔

شیمپو کے نقصانات:

- شیمپو کے زیادہ استعمال سے بال روکھے اور بے جان ہو جاتے ہیں۔
- بالوں میں ڈینڈرف اور دیگر جلد کے امراض (Irritant contact dermatitis) پیدا ہو جاتے ہیں۔

پاؤڈر (Poweder)

پاؤڈر کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ خوشبودار پاؤڈر سبھی کی پہلی پسند ہوتی ہے۔ خوشبو دل و دماغ پر خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ ٹیلکم پاؤڈر زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ جسم کی بد بو اور دانے دور کرتے ہیں، جلد کو ملائم رکھتے ہیں۔ پونڈس، نائسل، جانسن اینڈ جانس وغیرہ کثرت سے استعمال کے جانے والے پاؤڈر ہیں۔ ٹالک لاطینی زبان کے لفظ ''ٹیلکم'' سے ماخوذ ہے۔ عربی میں اسے ''طلق'' کہتے ہیں۔ معدنی ٹالک قدرتی طور پر اسبیسٹوس سے قریب ہے۔ ٹیلکم (میگنیشیم سلی کون اور آکسیجن) ایک مٹی کا معدنیات ہے۔

پاؤڈر کے فوائد:

- ڈائپر ریش کو روکتا ہے۔
- جسم کی بدبو دور کرتا ہے۔
- جلد کو نرم کرتا ہے۔
- پسینہ کو جذب کرتا ہے۔
- چکنائی، داغ دھبے دور کرتا ہے۔
- فریشنر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

پاؤڈر کے نقصانات:

- الرجی، اس میں موجود باریک باریک زرات سے یا اس میں موجود خوشبو اور رنگ سے ہو سکتی ہے۔
- سانس پھولنا۔
- اسپریشن نمونیا اور گرانولوما ہو سکتا ہے۔
- اس میں موجود اسبسٹوس سے کینسر کا خطرہ ہوتا ہے۔
- رحم کے کینسر۔
- نقصانات سے بچنے کے لیے ایسے پاؤڈر استعمال کیے جانے چاہیے جن میں ٹالک نہ ہو جیسے کشا بے بی پاؤڈر وغیرہ۔

اینٹی ایجنگ پروڈکٹس (Anti aging products)

قدرتی طور پر جوانی میں جلد میں چمک اور چہرے پر رونق رہتی ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے جسم کا ہائیڈریشن کم ہو جاتا ہے اور جلد پر باریک باریک لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ اس وقت جلد کی بہتر نگہداشت کیلئے غذا کے علاوہ کچھ مصنوعی پروڈکٹس سے مدد لی جا سکتی ہے خاص طور پر اینٹی ایجنگ پروڈکٹس۔ ماہرین جلد کے مطابق روزمرہ زندگی میں اسٹریس اور پولیوشن زیادہ بڑھنے سے 25 رسال کی عمر سے جلد میں تبدیلیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں مگر اس کے اثرات 30 رسال کی عمر میں ظاہر ہوتے ہیں (سیاہ دھبے جلد کی عمر بڑھنے کی اولین علامتوں میں سے ایک ہے)۔ اس عمر سے جلد کی تحفظ اور صحت مند رہنے کے لیے مصنوعی پروڈکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔

جلد کا تحفظ:

- دھوپ سے جلد کو بچائیں (ڈھانک کر یا سن اسکرینگ لگا کر)
- Self-tanner استعمال کریں۔
- سگریٹ اور شراب سے پرہیز کریں۔
- بار بار کے .facial expressions سے بچیں۔
- متوازن غذا استعمال کریں۔

- غذا میں پپیتہ، انار، سوکھے میوے، بروکولی، پالک، رتالو، گہرے سیاہ چاکلیٹ وغیرہ مفید ہیں۔
حیاتیں (اے سی بی کے)، نمکیات (کیلشیم، پوٹاشیم، میگنیشیم، فاسفورس وغیرہ) جلد کے لیے نہایت ہی مفید ہیں۔
- ورزش کی عادت ڈالیں۔

اینٹی ایجنگ پروڈکٹس کے استعمال:

- اینٹی ایجنگ پروڈکٹس جلد کی چمک کو برقرار رکھتے ہیں۔
- اینٹی ایجنگ پروڈکٹس 6 ہفتے سے 3 مہینے تک استعمال کر سکتے ہیں۔
- جلد پر باریک باریک لکیریں پڑ جانے hyaluronicacid اور
- Retinol, retinal aldehyde (Retin-A), retinyl esters, adapalene, tazarotene and tretinoin مفید ہیں۔ Retinot night cream مفید ہے۔
- جھریاں پڑنے سے عمر سے زیادہ نظر آنے کی وجہ تیز دھوپ ہے، اس کے لیے صابن نہیں استعمال کریں کیونکہ جلد کا پی ایچ ایسڈک ہوتا ہے اور صابن کا پی ایچ الکلائن ہوتا ہے۔ اس کے لیے موائسچرائزر استعمال کرنا چاہیے جو جیل اور اسینشیل آئل سے بنے ہوں۔ Glycerin and Hyaluronic بہت مفید ہیں۔ Neutrogena Rapid Wrinkle Repair مفید ہے۔
- اگر جلد پر سیاہ دھبے ہوں تو بھی موائسچرائزر اور بلیچ کریم سے راحت ہوتی ہے (hydroquinone) alone or with retinoids (tretinoin) and a mild steroid سے بنی ہوئی ہوں۔ نائٹ کریم بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ Cream Melamite بہت مفید ہے۔
- نائٹ کریم جلد کی خراش یا سوزش سے بچنے اور ہائیڈریشن کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔
- اینٹی ایجنگ پروڈکٹس (موائسچرائزر اور سیرم) ریٹی نول اور ہائلورونک ایسڈ جلد کی عمر بڑھنے سے نہیں روکتے بلکہ اس عمل کو آہستہ کر دیتے ہیں۔
- سن اسکرینگ پروڈکٹس کی ضرورت صرف باہر ہی نہیں گھر کے اندر بھی ہوتی ہے۔ Cetaphil sun مفید ہے۔
- الٹراوائلیٹ اور انفراریڈ یعنی بلیولائٹ سے بھی جلد خراب ہوتی ہے۔ اور جلد پر داغ دھبے آتے ہیں۔
- کوجک ایسیڈ اور وٹامن سی بھی داغ دھبے دور کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ Kojic acid cream 2% بہت مفید ہے۔
- Laser and intense pulsed light. داغ دھبوں کو ختم کرتے ہیں۔

اینٹی ایجنگ پروڈکٹس کے نقصانات:

- کاسمیٹک پروڈکٹس زیادہ تر مفید ہیں لیکن کچھ پروڈکٹس نقصاندہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ کہاں اور کتنا استعمال کیا گیا ہے۔
نقصانات سے بچنے کے لیے قدرتی اشیاء کا استعمال کرنا چاہیے جیسے سیلولوس فائبرل، بیکٹیریئل سیلولوس وغیرہ۔
- کچھ کاسمیٹک پروڈکٹس سے سوزش ہوتی ہے اور جلد پر دانے نکل آتے ہیں۔
- کچھ پروڈکٹس دوران حمل نہیں استعمال کر سکتے۔
- کچھ اینٹی ایجنگ سیرم سے جلد میں روکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر جب کاسمیٹک پروڈکٹس میں گلائیکولک ایسیڈ اور سلی سائیلیک ایسڈ ہوں۔ اس سے بچنے کے لیے سیرم کے استعمال کے بعد موائسچرائزر استعمال کرنا چاہیے۔

❒❒❒

Dr. Abu Talib Ansari
187,Ghouri Pada
Bhiwandi Thane-421308 (M.S)
9823755795
drabutalibansari@gmail.com

اپیل

ماہنامہ خواتین دنیا آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے اپنی گرانقدر رائے سے ضرور نوازیں۔ میگزین میں شائع ہونے والے مضامین، عنوانات اور مختلف ادبی شخصیتوں کی نشاندہی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ رسالے کو مزید بہتر بنانے میں ہمیں مدد مل سکے۔ (ادارہ)

مراسلہ

مکرمی، سلام مسنون۔

''خواتین دنیا'' برائے اگست 2024 یوم آزادی کی مبارکباد یوں کے ہمراہ موصول ہوا۔ آپ تمام بلکہ تمام تر ہم وطنوں کو بھی آزادی کی بہت بہت مبارکباد۔ یہی سب کچھ نہیں بلکہ جہاں تک آدھی آبادی کا تعلق ہے ان کے لیے بہت ساری اہم اسکیمات کی بھرمار ہے جن کا خواتین کی ترقی میں اہم ترین رول ہے۔ یہ تقریباً کوئی تین درجن اسکیمات ہیں جن کی شروعات بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ سے ہوتی ہے۔ اگر انھیں منظم ترتیب میں کیا جائے تو ایسے کہیں گے ۔

بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ، بیٹی بڑھاؤ

خواتین کی ترقی سے ملک و قوم کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور جو حالات میں بہتری کا موجب ہوتی ہے۔ ایسے اقدامات اور اسکیمات کی حوصلہ افزائی اور ستائش واجب ہے کیوں کہ ان سے خواتین کو بہرصورت افادیت، معاشی خود مکتفی اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے خواتین کو چاہیے کہ حکومت کے اس مشن کو پروان چڑھانے میں بھرپور معاونت کریں۔

بشمول اداریہ اس شمارہ کی مشمولات میں کوئی گیارہ شہ سرخیاں شامل ہیں جن کے تحت 24 ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ جنھیں چودہ خواتین قلمکاروں نے زیب و زینت میں اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ تقریباً آدھ درجن مصنفین نے بھی اپنی نگارشات سے اس کی تابندگی میں مزید رونق بخشی۔ ''انٹرویو'' کے ذیل میں جناب صدر عالم گوہر نے ''معروف موسیقارہ اوشا کھنہ سے گفتگو'' کے دوران جو انٹرویو لیا ہے نہایت دلچسپ ولا جواب ہے۔ اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں اور طبیعت ہے کہ مطالعہ پر مائل رہتی ہے اور دلچسپی از اول تا آخر تک برابر برقرار رہتی ہے۔ ''نکہت سخن'' میں آٹھ شاعرات کے دگنے اشعار دیئے گئے ہیں جو دل کو چھو لیتے ہیں کہ طبیعت ہے کہ مسلسل مطالعہ پر مصر رہے۔ چوتھی شہ سرخی ''خواتین: تعلیم، سیاست، معاشرت اور معیشت'' میں پہلا مقالہ جناب خواجہ عبد المنتقم صاحب کا تحریر کردہ ہے جس میں خواتین کے خلاف جرائم سے متعلق بحث

کی گئی ہے اور ایک ایک نکتہ کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے تاکہ خواتین کے خلاف سرزد جرائم کی سنگینی کی صراحت ہوتی رہے اور ان کے عین مطابق تعزیزی دفعات کا نفاذ اور سزا کا تعین واضح ہوجائے۔ بڑا علمی اور اسلوبی مضمون ہے جو یقیناً پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں دوسرا مقالہ بعنوان ''ہندوستانی خواتین کی تعمیر وترقی میں سرکاری اقدامات'' ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں بھارت سرکار کی جانب سے خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے افادیت سے لبریز ہیں۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر مسرت کا مرقومہ ہے۔ عنوان ہے ''ہندوستانی خواتین: سماجی، اقتداری اور سیاسی تبدیلیاں''۔ یہ مضمون جیسا کہ مذکور ہے، صنفی مساوات اور خواتین کی خوداختیاری موضوع وردِعمل سے متعلق ہے۔ اس میں گوکہ عمومی طور پر عالمی سطح کے لحاظ سے سماجی اور معاشی منصوبہ بندی میں اہمیت رکھتا ہے۔ پر ہندوستان میں پدرگسترانہ دباؤ کے برخلاف صنفی مساوات کی تحریک پر زور دینا مقصود ہے۔ اور یہ صنفی مساوات اس مضمون کے تمام صفحات پر منتشر ہے۔ جس کے لیے انگریزی کی کوئی 10 حوالہ جاتی کتب سے بھرپور مدد لی گئی ہے۔ چوتھا مضمون بعنوان ''خواتین کی تعلیم: نئی تعلیمی پالیسی کے پس منظر میں'' محترمہ رانی حفیظ صاحبہ کا نوشتہ ہے۔ اس کے ذیل میں عشری تعلیمی پالیسی کے پس منظر میں ہندوستانی خواتین کی تعلیم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں اور اس سلسلہ کا آخری مقالہ بعنوان ''خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت ہند کے منصوبے'' محترمہ ناہیدہ شفیع کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سرورق کا مقالہ کہلایا جاسکتا ہے۔ جس میں لڑکیاں پریڈ کے انداز میں اپنی منزل کی جانب اپنے قدم بڑھا رہی ہیں۔ اس میں حکومت ہند کی جانب سے خواتین کے لیے اختیار کی گئی پالیسیوں کا بکھان ہے۔ اور انھیں نہایت احتیاط و اعتماد سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ ''جہانِ نسواں'' میں بھی پانچ مضامین درج ہیں گوکہ اس کا عنوان جہانِ نسواں دیا گیا ہے لیکن کیفیات تقریباً تمام تر مردوں کے گرد گھومتی تو ہیں مگر مصنفہ خواتین ہیں۔ بہرحال پہلا مقالہ ڈاکٹر پروین شجاعت کا تحریر کردہ ہے مگر انھوں نے ایک نادر مثال ''سہیل کاکوروی'' کی یہ دی ہے کہ اُن کا وجود ایک شمع کی مانند تھا کہ سب کو منور بھی کریں اور سب سے جُدا بھی ہنستے مسکراتے رہیں۔ یہ مضامین نہ تو تحقیقی نوعیت کے ہیں اور نہ تنقیدی بلکہ محض تقریظی وتعریفی ہیں کہ یہ لوگ تھے ہی ایسے۔ دوسرا مضمون ''ہمہ جہت شخصیت پروفیسر قمر رئیس'' پر لکھا ہوا ہے اور تحریر ہے محترمہ راشدہ خاتون کی۔ ان کا کہنا ہے کہ پروفیسر قمر رئیس کثیرالجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اس مضمون میں قمر رئیس کی پیدائش سے لے کر آخیر تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قمر رئیس کی تنقید پر بہت عمدگی سے رائے زنی کی گئی ہے جو دلچسپی سے بری پڑی لگتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے بیرونی ممالک کے دوروں پر پھر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہرحال یہ ایک ایسا مضمون ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ محترمہ درخشاں خورشید نے ''حسین الحق'' ناگہانی'' کے آئینہ میں'' تحریر کیا ہے جو اُردو فکشن یعنی افسانوی تحریر یا طبع زاد حیلہ سازی جو کچھ بھی سمجھ میں آئے، میں ایک معتبر نام ہے لیکن کم معروف سے لگتے ہیں۔ چوتھا مضمون بہت اہم ہے یعنی ''اُردو میڈیم طلبہ کو ترجمہ نگاری میں درپیش مسائل'' کو پیش کیا ہے۔ محترمہ ممتاز بانو نے۔ اس مقالہ میں ایک اہم بات یہ بتائی گئی ہے کہ ترجمہ نگاری میں درکار بہت سی دیسی اور بدیسی لغت نویسوں کی تیار کردہ لغات اور وضع اصطلاحات نہایت جامع معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ پانچواں اور آخری مقالہ بعنوان ''مرزا محمد رفیع سودا کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات'' محترمہ غزالہ شیریں کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے اسے مختلف اشعار اور اقتباسات سے تحقیقی نوعیت دینے کی سعی کی ہے ''حسنِ سخن'' میں دو غزلیں اور دو آزاد نظمیں شامل ہیں۔ سبھی اچھے اور رنگ برنگے پرچم جیسے پھریرے لگتے ہیں۔ ''افسانہ'' کے تحت پہلا افسانہ ''راہِ حیات'' پروفیسر فرخندہ ضمیر لودھی کا تحریر کردہ ہے۔ محترمہ نے اپنے اس افسانے کی ایسی نصیحت سے شروعات کی ہے جس سے سبھی واقف ہیں۔ اس میں یہ اندازہ (غلط یا صحیح) بھی ہوتا ہے کہ ساری ہی باتیں سنی سنائی ہوں گی۔ دوسرا افسانہ ''انتظار کے لمحے'' محترمہ ریشماں قمر کا تحریر کردہ ہے جس میں انتظار کے لمحے موت کی طویل نیند میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی ایک کھلونے کے لیے۔ ''صحت'' کے تحت ڈاکٹر احسان رؤف نے ''جامن کی اہمیت و افادیت'' بیان کی ہے۔ آخر میں ''مراسلہ'' میں محض ایک خط لکھا ہے اور بالکل اخیر میں ''خواتین کا خبرنامہ'' دیا گیا ہے۔ آدھی آبادی کے یہ احساسات جو قومی اردو کونسل کے توسط سے قاریوں تک پہنچتے ہیں یہ فضا میں گل تابدار سے دل خوش کن خوشبوئیں مہیا کرتا ماحول کو معطر کردے اور گیسوؤں سے رنگیں فضاء کو سُرمگیں کردے اور تب تک یہ سماں قائم رہے جب تک کہ انگلیوں میں اوراق الٹتے پلٹتے رہیں۔ فیض احمد فیضؔ نے کیا خوب عکاسی کی ہے۔ فیض۔

ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گلبدن گویا
کہیں قریب سے گیسو بدوش غنچہ بدست

مصطفی ندیم خان غوری، زرّین ولا، بی-11، گرین ویلی،
روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا) 431001

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

ترتیب و تدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

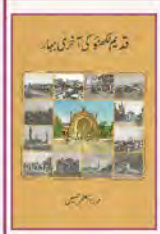

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

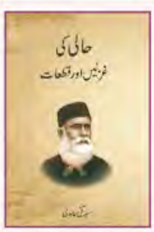

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अक्टूबर-२०२४ वर्ष: ८, अंक: १०

Mahnama Khawateen Duniya Monthly October 2024 ,Vol. 8, Issue: 10

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026

DL (S)-17/3555/2024-26

ISSN 2581-4826

Date of Publication: 13-10-2024

Date of Dispatch : 14 and 15 of every month

Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025